حرفِ آخر
تیج بہادر

تاریخ اشاعت : اپریل ۱۹۸۷ء

تعداد : ۱۰۰۰ (ایک ہزار) بار اوّل

مطبع : انٹرنیشنل پریس، لال نگر، چھانہ پورہ سرینگر کشمیر

قیمت : ۱۰ روپے

کاتب :

پبلشر : رائیٹرس پبلشرز

مصنف : تیج بہادر بھان، A-73، لال نگر، چھانہ پورہ
سرینگر، کشمیر

سرورق ڈیزائن : تیج بہادر

اِنتساب

اُن لوگوں کے نام

جنہیں

میری کتاب

"پہچان"

پر

اعتراض تھا!

۱۹۸۱ء میں راقم کی چوتھی تصنیف "پہچان" منظر عام پر آگئی۔ لوگوں نے کتاب پڑھی سراہی۔ مشہور ادبی ماہنامہ "آجکل" دہلی کے مارچ ۱۹۸۲ء کے شمارے میں تبصرہ شائع ہوا جس کے کچھ آخری کلمے قارئین کی توجہ مرکوز کرنے کیلئے رقم کرنے مناسب ہیں:-

"پہچان پہاڑیا کا تجزیۂ سائنس کو اور خود انسان کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اُن کی یہ کوشش ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے اور اُردو کی علمی کتابوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ۔"

نہ معلوم کیوں! اس کتاب کی اشاعت کے تین سال بعد اپریل ۱۹۸۶ء کے دوران کتاب پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اس کی اشاعت کے خلاف ہڑتالیں ہوئیں۔ جلسے اور جلوس منظم کئے گئے۔ راقم کے خلاف سڑکوں، چوراہوں پر زہر اُگلا گیا۔ ریاست کے سب رجعت پرست و کٹر پنتھی عناصر میرے خلاف صف آرا ہوئے

اَور حکومتِ وقت نے شرلپسند عناصر کی بیخ کنی کرنے کے بجائے مجھے ہی پابندِ زنداں کردیا۔

ملک بھر کے ترقی پسند ادب نواز اَور صحافی میرے آڑے نہ آتے یا پارلیمنٹ میں میری گرفتاری پر لے دے نہ ہوتی، تو شاید ہی حکومتِ وقت مجھ کو ضمانت پر رہا کرنے پر آمادہ ہوتی۔

ضمانت پر رہا ہونے کے بعد مجھ سے کیسا سلوک کیا جا رہا ہے، اس کی داستان رُوح فرسا بھی ہے اَور عبرت انگیز بھی، جس کی تفصیل ان صفحات میں دینا میرا مدعا نہیں۔ لیکن جس بات کی نشان دہی کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے، کہ جونہی میں جیل کی چار دیواری سے باہر آگیا، تو سب سے پہلے مجھے میرے گھر والوں نے آڑے ہاتھوں لیا، کہ بھلا جب میری ادبی کاوشیں، کہانیاں، ڈرامے اَور ناول لکھنے تک محدود تھیں، تو کیا ضرورت تھی "پہچان" جیسی زندگی کی حقیقت سے لبریز کتاب لکھنے کی، جس کی اشاعت کے صدقے میرے ساتھ ساتھ میرے گھر کے دوسرے افراد بھی رجعت پرست عناصر کے عتاب کا ہدف بن گئے۔

دوسرا اعتراض میرے دوستوں اَور بھلا چاہنے والوں نے

داغا، کہ میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میری بیوی ہے، بچے ہیں۔ میں سرکاری ملازم ہوں، نوکری سے سبکدوش ہونے میں ایک آدھ برس باقی ہے۔ جس کے بعد میں سرکار سے پنشن اور دیگر مراعات کا حقدار ہوں، سراسر بیوقوفی تھی، اس جیسی کتاب لکھنے کی اور ڈھلتی عمر میں برسوں کی تگ و دو کے بعد ان مراعات کو اپنے خیالات کی بھینٹ چڑھانے کی!

کچھ نامور ادیبوں اور دانشوروں نے سمجھایا کہ اس برصغیر کے عوام کا ذہن ابھی اس قابل نہیں، کہ میں "پہچان" جیسی زندگی کی حقیقت سے لبریز کتابیں لکھ کر اُن کو انسان کے حقیقی رُوپ سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہو سکونگا۔ اس لئے مجھے چاہیئے کہ اس قسم کی کتابیں لکھنے پر وقت ضایع کرنے کے بجائے عام پسند ادب کی تخلیق کر کے دامے درمے اپنی عاقبت سنواروں!

یہ تو رہی گھر اور خیر خواہوں کی باتیں، لیکن شرپسند اور کٹر پنتھی عناصر کی غلط بیانی نے عام معصوم لوگوں کو اس حد تک گمراہ کر دیا ہے کہ مجھے آئے دن دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ "پہچان" جیسی کتابیں لکھنے سے احتراز کر لوں، ورنہ......!

ان حالات میں کسی بھی عام انسان کا پریشان ہونا قدرتی

عمل ہے۔ میں بھی پریشان ہوں، اور سوچنے پر مجبور ہوں کہ "پہچان" جیسی کتاب لکھ کر بظاہر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ میں نے تو صرف عام فہم پیرائے میں سائنس اور تحقیق کے برتنے پر انسان کے صحیح وجود اور سرشت کی تفسیر قلم بند کی ہے، کہ جسے پڑھ اور سمجھ کر عام انسان مستفید ہو سکتا ہے۔ غلط بیانی ہوتی، تو شر پسند، رجعت پرست، کٹر پنتھی عناصر، ملڑ بازی اور شور و شر برپا کرنے کے بجائے منطق اور دلائل کی دہلیز پر انصاف ڈھونڈھنے نظر آتے۔

کیا عام انسان سوچنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

کیا عام انسان سمجھنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

کیا عام انسان اپنے ذہن کے دریچے بند رکھ فرسودہ رسم و رواج اور اندیشوں، عقیدوں میں ہی جکڑا رہنا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

میں خود بھی تو ایک عام انسان ہوں، ایک عام سے خاندان کا فرد، ایک عام انسان کی طرح رسم و رواج اور عقیدوں کے بیچ پروان چڑھا۔ ایک عام انسان کی طرح روائیتوں کے بیچ پلا بڑھا۔ پھر بھلا مجھے "پہچان" جیسی کتاب لکھنے کی تحریک کہاں ملی ۔ ۔ ۔ کیسے ملی ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں ملی ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

انسانی جنس میں ایک عام انسان ایک خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ خاندان میں انسانی جنس کے کچھ افراد مل جل کر زندگی گذارتے ہیں۔ زندگی برقرار رکھنے کی خاطر دن بھر مختلف قسم کی ہر کانت، دوڑ دھوپ یا دوسرے لفظوں میں محنت مزدوری میں جٹے رہتے ہیں، اور رات گئے بارش، طوفان، سردی، گرمی، درندوں، مکوڑوں اور دیگر خطرات سے محفوظ رہنے کی خاطر کسی چار دیواری میں سر چھپاتے ہیں۔ کسی خاندان کے پاس غار ہوا کرتی تھی۔ کسی خاندان کے پاس جھگی جھونپڑی اور کسی خاندان کے پاس کچا پکا مکان، جس کو انسان پیار سے گھر کہہ کر پکارتا ہے۔ گھر خاندان کی مجموعی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور انسان کی زندگی کا محور۔

کئی گھر مل کر گاؤں کہلاتے ہیں۔ کئی گاؤں مل کر قصبے اور کئی قصبے مل کر ملک بن جاتے ہیں۔ ملک کے ہر قصبے کا رشتہ ہر دوسرے قصبے سے جڑا ہوتا ہے۔ قصبے کے ہر گاؤں کا رشتہ ہر دوسرے گاؤں سے جڑا ہوتا ہے۔ گاؤں کے ہر گھر کا رشتہ ہر دوسرے گھر سے جڑا ملتا ہے۔ یوں ہر خاندان کا دوسرے ہر خاندان سے وابستہ ہوتا ہے، اور ملک میں انسانی جنس کا معاشرہ کہیئے یا سماج کہیئے جنم

لیتا ہے۔ یہ ترتیب بلالحاظ ملّت و مذہب، قوم، نسل، کرۂ ارض پر کُل اِنسانی جنس پر حاوی ہے۔ یوں اِنسانی خاندان اِنسانی جنس کے کسی بھی معاشرے یا سماج میں اِکائی (UNIT) کے درجے کا حامِل ہے۔

ظاہر ہے کہ اکائی (UNIT) میں محرک قوت، خاصیت اور قانون پُورے (WHOLE) میں محرک قوت، خاصیت اور قانون کے غماز ہوتے ہیں۔ کھانڈ کے واحد دانے (UNIT) میں وہی ذائقہ، رنگ، بُو ملتی ہے، جو کھانڈ کے ڈھیر (WHOLE) میں ہوتی ہے۔ اِس لئے اِنسانی معاشرے (WHOLE) میں محرک قوت، خاصیت اور قانون کا تجزیہ کرنے کے لئے خاندان (UNIT) میں محرک قوت، خاصیت اور قانون کا تجزیہ کرنا ازبس ضروری ہے۔

لیکن اِنسانی جنس میں خاندان کو معاشرے (WHOLE) کی اِکائی (UNIT) کی حیثیت عطا کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنے زبردست ضرورت ہے کہ جب اِنسانی جنس میں ہر انسان منفرد حیثیت کا حامِل ہے، تو خاندان (اِفراد کا مجموعہ) کو انسانی معاشرے کی اِکائی کا درجہ حاصِل نہیں۔ اس گتھی کو سُلجھانے کے لئے انسان

کو صدیوں کے دوران حاصل ہوئے کائنات کے علم کا مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہے کہ خاندان کا وجود کائنات پر حاوی کن اصولوں کے تحت عمل میں آیا، کیوں آیا، اور معاشرے (WHOLE) کی اکائی (UNIT) کا درجہ کس برتے پر حاصل کیا۔

کائنات کی کھوج اور تحقیق نے یہ حقیقت پایۂ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ کل کائنات میں مادے کی ہر ذات یا جنس چاہے لوہا ہو، سونا ہو، ہوا ہو، پانی ہو، مٹی ہو، پتھر ہو، جاندار ہو یا بے جان مادے کی اکائی ائیٹم (ATOM) کے برتے پر وجودیت کا مرہون منت ہے۔ ائیٹم کی بناوٹ کے اجزا یعنی الیکٹرون (ELECTRON)، پروٹون (PROTON)، نیوٹرون (NEUTRON) اور ایسی ہی دیگر قوتوں کے ذرات کی کمی و بیشی مادے کو مختلف روپ عطا کرتی ہے ان قوتوں کے ذرات کی کمی بیشی کسی ائیٹم کو لوہے کی ذات میں ڈھالتی ہے، اور کسی ائیٹم کو سونے کی ذات عطا کرتی ہے، مثلاً ایک الیکٹرون اور ایک پروٹون کی بناوٹ کا ائیٹم ہائیڈروجن (HYDROGEN) کا روپ پاتا ہے کہ جیسے دیا سلائی دکھاؤ تو آگ پکڑ لیتا ہے، لیکن سولہ الیکٹرون اور سولہ پروٹون پر مشتمل ائیٹم ایک دوسری ذات

آکسیجن (OXYGEN) کا رُوپ اختیار کرتا ہے، جس کی بدولت دیا سلائی بھڑک تو اُٹھتی ہے، لیکن خود آگ نہیں پکڑتا۔

ایک ہی ذات کے مادّے میں ایک ہی قسم کے اُیٹم ملتے ہیں جس مادّے کی ذات میں موجود ہر اُیٹم کی بناوٹ کے اجزاء یعنی قوت کی کمی بیشی ہر دوسرے ایٹم کی بناوٹ کے اجزاء یعنی قوت کے ذرّات کی کمی بیشی کے ہو بہو برابر ہوتی ہے۔ ایسی مادے کی ذات کو بُنیادی ذات (ELEMENT) کے نام سے نوازا گیا ہے، جیسے سونا، چاندی، فاسفورس، ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ۔

بُنیادی ذات (ELEMENT) کے اُیٹم میں موجود قوت کے ذرّات کی کمی بیشی اس کو کسی دوسری بُنیادی ذات کے اُیٹم میں موجود قوت کے ذرّات کی کمی بیشی سے منسلک ہو کر توازن حاصل کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ یوں کچھ مادّے کی بُنیادی ذاتوں (ELEMENTS) کے ردِّ عمل (REACTIONS) اور گٹھ جوڑ سے ہماری کائینات تشکیل ہوئی ہے، اور کائینات میں اَن گِنت مادے کی ملی جُلی ذاتیں وجود میں آگئی ہیں۔ ان سب ملی جُلی ذاتوں کو سائینسی زبان میں مرکبات (COMPOUNDS) کے نام سے ظاہر کیا جاتا ہے، جیسے آکسیجن

اور ہائیڈروجن جیسی بنیادی ذاتوں (ELEMENTS) کے
ردِّ عمل (REACTION) سے پانی جیسی مِلی جُلی ذات (COMPOUND)
وجود پاتی ہے۔ جو آگ بھڑکاتا نہیں، بلکہ آگ بجھانے میں مدد دیتا ہے۔
چونکہ مادے کی بنیادی ذات (ELEMENT) میں ایک ہی
قسم کے ایٹم پائے جاتے ہیں، اس لئے ایٹم کو بھی اُس بنیادی ذات کی
اکائی کا درجہ حاصل ہونا لازم تھا۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ کسی
بھی بنیادی ذات کو الگ الگ ایٹم میں بانٹا جائے، تو اُس مادے کی ذات
کے ایٹم کے اجزاء یعنی قوت کے ذرات کی کمی بیشی ہو بہو برابر ہونے کے
باوجود کسی صورت اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ پاتے، بلکہ دو دو یا تین
تین کے جھنڈ میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مزید کھوج اور تحقیق سے
انکشاف ہوا ہے کہ ان انفرادی ایٹموں کی اندرونی ساخت میں
کجی اور ذات کے انفرادی ایٹم سے منسلک ہو کر توازن حاصل کرنے
کی یا دوسرے لفظوں میں مِلی جُلی ذات (COMPOUND)
بنانے کی صفت کسی نئی ذات کا انفرادی ایٹم نہ ملنے پر اپنی ہی
ذات کے کسی اور انفرادی ایٹم سے منسلک ہونے پر مجبور کرتی ہے۔
یوں ایک ہی ذات کے ایٹم اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر

دو دو یا تین تین سے جھنڈ میں منسلک ہو کر ذاتِ انحاصل کرتے ہیں، جن کو سائنسی اصطلاح میں مالیکیول (MOLECULE) کہا جاتا ہے۔

پس واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات میں مادے کی کسی بھی ذات یا جنس کا ایٹم گو اکائی (UNIT) کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ایک سے زیادہ تعداد یعنی مالیکیول (MOLECULE) کی صورت پا کر اپنی انفرادیت اور درجے کو کھو کر مالیکیول کو اکائی کے درجے پہ لا کھڑا کرتا ہے، جس کو ہم اس ذات یا جنس کے خاندان کا نعم البدل سمجھیں، تو غیر سائنسی زبان میں غیر موزون نہیں، اور قدرتی طور پہ مالیکیول (خاندان) اس مادے کی ذات (WHOLE) کی اکائی (UNIT) کے درجے کا حامل بن جاتا ہے۔

انسانی جنس میں زندگی وجودیت کی حامل ہے۔ اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں، لیکن زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے افراد پر کچھ جسمانی، ذہنی ساخت کی پیچیدگیاں حاوی ہوتی ہیں، جیسے تولید کی خاصیت، پیار کی طلب، سوچنے سمجھنے کی قوت۔ جن پیچیدگیوں کے تحت انسانی جنس کے افراد (ATOM) ایک دوسرے سے منسلک ہو کر خاندان (MOLECULE) کی تشکیل کرتے ہیں، اور

نتیجے کے طور پر انسانی معاشرے (WHOLE) میں انسانی فرد کے
بجائے خاندان اکائی (UNIT) کا درجہ حاصل کر پاتا ہے۔

آج انسان کا ذہن ارتقاء کی ایسی منزل پر کھڑا ہے،
جہاں وہ ماضی، حال اور مستقبل میں تسلسل برقرار رکھنے کی اہلیت
سے لیس ہے، جب کہ انسان سے کم ذہن رکھنے والے جنس مثلاً
چرند، پرند، درندے، حیوان صرف نر و مادہ اور بچوں کی حد تک
کچھ دیر کے لیے خاندان برقرار رکھ پاتے ہیں۔ ان ذاتوں سے بھی
کم ذہن رکھنے والی ذاتیں مثلاً کیڑے مکوڑے، مچھر، مکھیاں وغیرہ
صرف تولید کے مرحلے تک خاندان کو برقرار رکھ پاتی ہیں اور جن
ذاتوں میں ذہن سرے سے غائب ملتا ہے، ان ذاتوں میں
خاندانوں کا وجود بھی غائب ہوتا ہے جیسے امیبا (AMOEBA)
اور اسی قبیل کی اور ذاتیں۔

ارتقاء کی موجودہ منزل پر انسانی جنس میں خاندان انسان کے
طاقتور ذہن کی بدولت صرف تولید کے مرحلے تک ہی محدود نہیں،
بلکہ کچھ اور افراد بھی منسلک رہ کر خاندان کی تشکیل کرتے ہیں، اور
انسانی ذات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی ذات سے وابستہ

خاندان بھی اِرتقاء کی راہ پر گامزن ملتا ہے۔

اِنسانی جنس کے عام سے خاندان میں ایک بوڑھا مرد ہوتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت ہوتی ہے۔ ایک جوان مرد ہوتا ہے، ایک جوان عورت ہوتی ہے، ایک بچہ ہوتا ہے، ایک بچی ہوتی ہے۔

بوڑھا مرد، بوڑھی عورت کا خاوند ہوتا ہے۔ ان کے درمیان تولید کا رشتہ ہوتا ہے۔ جوان مرد کا باپ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ خون کے پہلے درجے کے رشتے میں منسلک ہوتا ہے۔ جوان عورت کا سسر کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ذہنی رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ بچوں کا دادا کہلاتا ہے، ان سے خون کے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔

بوڑھی عورت، بوڑھے مرد کی بیوی ہوتی ہے، ان میں تولید کا رشتہ ہوتا ہے۔ جوان مرد کی ماں ہوتی ہے، اور اس سے براہ راست خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔ جوان عورت کی ساس کہلاتی ہے، اور اس سے ذہنی رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔ بچوں کی دادی کہلاتی ہے اور ان کے ساتھ خون کے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔

جوان مرد، بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کا بیٹا ہوتا ہے، اور اُن سے خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ جوان عورت کا خاوند ہوتا ہے اور اس سے تولید کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ بچوں کا باپ کہلاتا ہے اور اُن سے خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔

جوان عورت، جوان مرد کی بیوی ہوتی ہے، اور اُس سے تولید کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کی بہو کہلاتی ہے، اور ان سے براہ راست خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔

بچہ، جوان مرد اور جوان عورت کا بیٹا ہوتا ہے، اور اُن سے خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کا پوتا کہلاتا ہے، اور اُن سے خون کے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھا ملتا ہے۔ بچی کا بھائی لگتا ہے، اور اُس سے بھی خون کے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔

بچی، جوان مرد اور جوان عورت کی بیٹی ہوتی ہے، اور اُن سے خون کے پہلے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کی پوتی کہلاتی ہے، اور اُن سے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھی ملتی ہے۔ بچے کی بہن لگتی ہے، اور اُس سے بھی خون کے دوسرے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے۔

ایسا خاندان انسانی جنس کے ماضی (بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت)، حال (جوان مرد اور جوان عورت) اور مستقبل (بچہ اور بچی) کے تسلسل کے علاوہ انسان کے جسمانی و ذہنی بلوغیت یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی بھی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ چاہیئے سبندھ

[حاشیہ:] جوان عورت ... اور اُن سے ... دوسرے درجے کے رشتے میں بندھی ہوتی ہے

معاشرہ ہو، اسلامی معاشرہ ہو، کرسچین معاشرہ ہو یا جرمن معاشرہ ہو، روسی معاشرہ ہو، امریکی معاشرہ ہو یا ڈیموکریٹک معاشرہ ہو یا گیر ... معاشرہ ہو، غرضیکہ صفحۂ ہستی پر موجود کسی بھی قسم کے انسانی جنس کے معاشرے میں انسانی خاندان کی کم و بیش یہی صورت ملتی ہے۔ لیکن ہر انسانی معاشرے میں خاندان انسانی فرد کی وجودیت کا ضامن ملتا ہے، اِس لئے انسانی جنس پر مسلّط رشتوں، ناطوں اور اصولوں کی نشاندہی کرنے کے لئے ایسے خاندان کو مثالی خاندان کے طور پر سائینسی، تحقیقی، منطقی کسوٹی پر تختۂ مشق بنایا جانے میں کوئی قباحت نہیں۔

گھر چونکہ خاندان کی مشترکہ ملکیت کے آغاز کا محرک ہے۔ اِس لئے خاندان کے مختلف افراد کے ملکیت کے حقوق کا تعیّن کرنے کے لئے گھر کو ہی اوّلین درجہ دینا پڑتا ہے۔

گھر میں رہنے والے خاندان کے مختلف افراد کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ خاندان کے کسی بھی فرد کو خاندان کی ملکیت یعنی گھر آنگن کے کسی بھی کونے اور کھڑے کو استعمال کرنے پر کسی بھی قسم کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ دادا دادی جہاں اُن کا دل چاہے بیٹھ سکتے ہیں، آرام کر سکتے ہیں یا چہل قدمی کر سکتے ہیں،

بشرطیکہ خاندان کے کسی اَور فرد کی حرکات میں حائل نہ ہوں۔

جوان مرد اَور جوان عورت جہاں چاہیں کھڑے ہو سکتے ہیں، لیٹ سکتے ہیں، دِل بہلا سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کی یہ حرکتیں خاندان کے کسی اَور فرد کی حرکات پر حاوی نہ ہوں۔

رہی بچّہ اَور بچّی کی بات، اُن کا کیا، جہاں دِل چاہا، کھیلا، اُودھم مچایا بشرطیکہ اُن کی ہڑبونگ خاندان کے کسی اَور فرد کی حرکات پر اثر انداز نہ ہونا۔

یہ تو ہوئی گھر جگہ کی باتیں، لیکن خاندان کے کسی بھی فرد میں اجتماعی ملکیت کا احساس ہونے کے باوجود یہ خیال سَر نہیں اُبھارتا کہ یہ برتن واحدؔ اس کا برتن ہے، وہ میز واحدؔ اس کی میز ہے۔ اس کونے میں پھیلایا بچھونا، واحدؔ اس کا بچھونا ہے۔ اُس کھڑکی پہ رکھا گلدان واحدؔ اُس کا گلدان ہے۔

جتنی دیر خاندان کے کسی بھی فرد کو گھر کے کسی بھی کونے کھدرے یا برتن یا میز کی یا گھر میں میسر کسی بھی اَور چیز کی ضرورت ہوتی ہے اُتنی دیر کے لیے وہ چیز اس فرد کی نجی ملکیت کے زمرے میں شمار ہوتی ہے، ضرورت ختم ہو جاتی ہے، تو فرد کی نجی ملکیت کے حقوق بھی

قایم نہیں ملتے، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خاندان میں نجی ملکیت کے دائمی حقوق ہر سے مفقود ملتے ہیں۔ واحد گاڑی حسبِ توفیق بیل گاڑی ہو یا موٹر، ہوائی جہاز، ہر کوئی ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے، واحد برتن، مٹی کا ہو یا سونے، چاندی کا ہر کسی کے کام آتا ہے۔ واحد پنکھے کی ہوا ہر فرد کا بدن ٹھنڈا کرتی ہے، اور واحد لمپ کی روشنی ہر ایک کا وجود منور کرتی ہے۔

نجی ضرورت کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے، تو خاندان میں تسلط ایک اور اصول کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ لباس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کپڑے کے تھان کو ضرورت کے لحاظ سے بانٹا جاتا ہے۔ بچوں کے لباس تیار کئے جائیں، تو بچوں کی نجی ملکیت کا رتبہ حاصل کرتے ہیں، کیونکہ خاندان کے باقی افراد مخصوص تن توش رکھنے کی وجہ سے بچوں کے ننھے ننھے لباس استعمال کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مردانہ ملبوسات تیار کئے جائیں، تو بوڑھا مرد اور اس کا بیٹا جوان مرد ان کپڑوں کو استعمال کر پاتے ہیں، لیکن خاندان کی خواتین اور بچے مخصوص ساخت اور تن و توش کی بناء پر ان کپڑوں کو استعمال کرنے سے عاری ہوتے

یوں خاندان میں کچھ چیزیں مخصوص ساخت اور سائز کے برتنے پر مختلف افراد کی نجی ملکیت میں شمار ہو سکتی ہیں، لیکن خاندان میں کپڑے کا تھان میسر نہ ہونے کی صورت میں بڑے تن و توش افراد کا لباس ضرورت کے مطابق چھوٹے تن و توش یعنی بچوں کے لباس میں تبدیل کرنے پر کوئی روک نہیں ملتی، جیسے کہ زنانہ ملبوسات جیسے ساڑھی، فراک وغیرہ کو بھی مردانہ ملبوسات جیسے پتلون شرٹ، جانگئے یا رومال وغیرہ میں تبدیل کرنے پر کسی قسم کی بندش نہیں پاتی۔ دیکھتے دیکھتے خاندان کے کسی بھی فرد کی نجی ملکیت بہ لحاظ ضرورت خاندان کے کسی اور فرد کی نجی ملکیت کا بھی درجہ اختیار کرتی ہے۔

لیکن کپڑے کے تھان کو انفرادی لباس میں تبدیل کرنے کے بجائے بغیر کانٹے چھانٹے کے استعمال میں لایا جائے تو خاندان کے کسی بھی فرد کی نجی ملکیت کا رتبہ حاصل نہیں کر پاتا، بلکہ خاندان کا ہر فرد اس کو بوقت ضرورت بطور چادر اوڑھنے، بچھونے کے لئے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔

نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی خاندان کے افراد میں ذاتی یا نجی ملکیت کا تصور مشترکہ ملکیت کے اصول پر غالب نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو صرف فرد کی ضرورت کے احساس کے تابع ملتا ہے۔

نہ ہی ملکیت کے ایسے عارضی احساس کے تحت خاندان کے افراد کے مابین کسی قسم کا مادی یا جذباتی استحصال کیا جاتا ہے۔ استحصال کیا جائے تو خاندان کے افراد ایک دوسرے سے بدظن ہو کر خاندان کی وحدت برقرار نہیں رکھ پاتے ہیں، اور خاندان بکھر جاتا ہے۔ خاندان جو کائینات میں انسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔

زندگی کی بنیادی ضرورت خوراک ہوتی ہے، جس کے بل بوتے
پر انسان اپنی زندگی بدستور برقرار رکھنے کی قوت سے لیس ہوتا ہے۔
چاول، گیہوں، ساگ سبزی، دودھ، پھل، گوشت، انڈے اور دیگر ایسی
ہی چیزیں انسان کے خوراک کے دائرے میں شمار ہوتی ہیں، جن کو کھا
کے ہضم کرکے انسان اس قابل رہتا ہے کہ کائنات میں ہر اور جنس
سے لڑ بھڑ کر یا محنت مشقت کرکے اپنے لئے مزید خوراک حاصل کرسکے۔
غلط سوچ اور ارادوں کے زیر اثر انسان اپنی محنت مشقت خوراک جیسی
بنیادی پیداوار حاصل کرنے کے بجائے سونا، چاندی اور پیسے جیسی
سطحی پیداوار حاصل کرنے پر صرف کرے، تو خوراک کی پیداوار حاصل
کرنے کے بجائے سونے چاندی کے ڈھیر حاصل کرسکتا ہے، جو اس کی انا
کی تسکین کا باعث ضرور بن جاتے ہیں، لیکن اس کی بھوک نہیں مٹا سکتے۔
مخصوص ساخت کی بناء پر انسان اس قسم کی پیداوار استعمال کرنے
سے قاصر ہوتا ہے۔

خاندان کے افراد بھی اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دستر خوان پر مل بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں بحسب حیثیت چاول، روٹی، ساگ سبزی، گوشت، انڈے وغیرہ دستر خوان پر سجائے جاتے ہیں۔ چونکہ عام خاندان میں چوہے چوکے اور کھانا پکانے، پروسنے کا کام جوان عورت کے ذمے تصور ہوتا ہے، اس لئے خاندان کی بہو اپنی سوچ اور سمجھ کو بروئے کار لاکر خاندان کے افراد کے لئے خوراک مختلف تھالیوں یا پلیٹوں میں پروس دیتی ہے۔

ساس اور سسر کے لئے اتنے سے چاول، اتنی سی سبزی اور گوشت کی کچھ بوٹیاں اُن کی تھالیوں میں سجاتی ہے، کیونکہ ساس اور سسر سن رسیدہ ہونے کے کارن اتنی مقدار سے مزید خوراک ہضم کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔

چونکہ عام خاندان میں محنت مزدوری کا بوجھ جوانوں کے کاندھوں پر ہوتا ہے، اس لئے اپنے خاوند کی تھالی میں بہت سارے چاول، بہت ساری سبزی اور بہت سارے گوشت کی بوٹیاں خاوند کی محنت و مشقت کو مدِ نظر رکھ کر پروس لیتی ہے، جبکہ بچوں کی کم سنی کا لحاظ رکھ کر بیٹے بیٹی کی تھالی میں کچھ چاول کے دانے کچھ سبزی

اور گوشت کی ایک بڑی سی بوٹی اور چھوٹے بچے کی تھالی میں چاول سبزی کی خاص مقدار کے ساتھ گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی پروستی ہے۔

دفعتاً خاندان کا بوڑھا تاؤ کھانے لگتا ہے۔ وہ زیادہ گوشت ہضم کر سکے یا نہ کر سکے۔ لیکن خاندان کا بزرگ ہونے کے ناطے وہ خاندان میں سب افراد سے زیادہ گوشت کے ٹکڑوں کا حقدار ہے۔ شاید بہو سسر سے زیادہ اپنے خاوند کی عزت کرتی ہے۔

اِدھر خاندان کی بوڑھی الگ سے ناراض کہ بہو نے اُس کے خاوند کو نظر انداز کر کے اپنے خاوند کا زیادہ خیال رکھا، اور خود اُس کو بھی صرف گوشت کے چند ٹکڑوں کے قابل سمجھا۔ کیا معلوم بہو نے اپنا پاپی پیٹ بھرنے کے لئے رسوئی میں گوشت کی کتنی بوٹیاں چھپا رکھی ہوں.....!

یہ تو ہوئی بالغ لوگوں کی سوچ، جن میں خود غرضی کا عنصر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، لیکن بچوں کے معصوم ذہن بھی ظلم سے بچ نہیں پاتے۔ چھوٹا بچہ روٹھ کر تھالی پٹخ دیتا ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہو رہی تھی، اُس کے ساتھ کہ ماں نے اُس کو گوشت کی ایک اتنی سی بوٹی پر ٹرخا دیا جب کہ بڑے بچے کی تھالی میں گوشت کی بڑی بوٹی پروس دی۔ کیا وہ کسی سے کم ہے۔ ضرور ماں بڑے بچے کو زیادہ چاہتی ہے بڑے بچے سے

زیادہ پیار کرتی ہے۔ لیجیے...... ماں کی ممتا پر بھی شک ہونا شروع ہو گیا۔ چشم زدن میں ہنستے، کھیلتے خاندان میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔

خاندان کا ہر فرد ہر دوسرے فرد سے بدظن، پروسنے والا الگ سے نالاں۔ بظاہر پروسنے والے نے کھانا پروسنے کی حرکات سے خاندان کے سب افراد کی خدمت کی، لیکن باطن میں اس سارے واقعے پر اُس کی ذاتی سوچ غالب رہی۔ اُس کی اِنفرادی سوچ کھانا پروسنے کی حرکت کے ذریعے خاندان کے باقی سب افراد کی حرکات پر حاوی رہی۔ یوں غیر ارادی طور پر خاندان کے باقی سب افراد ایک واحد فرد کی سوچ کے تابع ہو گئے۔

اس کے برعکس کھانا تناول کرنے کی شروعات اس ڈھنگ سے کی جاتی کہ ساری خوراک دسترخوان پر سجانے کے بعد خاندان کا ہر فرد حسب منشاء اپنی تھالی خود پروس لیتا، تو ساس سسر ضعیف العمر ہونے کے کارن اپنے ہاضمے کا لحاظ رکھ کر شاید گوشت کی کچھ بوٹیوں کے بجائے ایک ہی بوٹی پر اپنے دانت آزماتے۔ بچے بھی بھوک کے لحاظ سے کم و بیش اتنا ہی کھا لیتے جتنا کچھ اُن کی تھالیوں میں ماں نے پروسا تھا۔ اس قسم کی شروعات میں ایک فرد کی انفرادی سوچ دوسرے افراد کی سوچ پر حاوی ہو کر انسان کی انا کو ٹھیس پہنچانے کا موجب بنتی ہے نہ ہی خاندان کے افراد کے مابین شک، رقابت اور رنجش کا احساس ابھارتی ہے۔

اَور نہ ہی ایسی شروعات سے خاندان کی وحدت میں رخنہ پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔

یہ کہنا سراسر کج بحثی ہے کہ مساوات (EQUALITY) ظاہری ماپ تول پر منحصر ہوتا ہے۔ ماپ تول کا تعیّن انسان کی انفرادی سوچ نہیں کرتی، بلکہ فرد پر مُسلّط کائینات کے اُصول تعیّن کرتے ہیں اَور فرد کی انفرادی ضرورت کی صورت میں آشکار ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے مساوات (برابر) کا لفظ اصل میں "بحا بِ ضرورت" کا ترجمان ہوتا ہے۔

"جس خاندان میں ہر فرد کی سوچ کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اُس خاندان کے افراد کے مابین کسی قِسم کی رنجش پیدا نہیں ہوتی، نہ خاندان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی نوبت آتی ہے" اَور خاندان اپنی وحدت برقرار رکھ کر فرد کی وجودیت کا ضامن رہتا ہے۔

خاندان میں ملکیت ہونے کے باوجود انسان کو خوراک حاصل کرنے کیلئے محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ملکیت بذاتِ خود پیداوار نہیں بلکہ ملکیت (جائیداد، زمین وغیرہ) کو تختۂ مشق بنا کر انسان اپنی محنت مشقت کو پیداوار میں تبدیل کرتا ہے، نہ کرے تو جائیداد، زمین رہیگی لیکن انسان نہیں رہے گا۔

خاندان کے ضعیف العمر افراد یعنی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت محنت مشقت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ دن بھر اونگھتے رہتے ہیں، یا بچوں سے گپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ بچے بھی کم سنی کی وجہ سے محنت مشقت کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں، اسلئے دن بھر کھیل کود اور دھما چوکڑی میں مست رہتے ہیں۔ ایسے افراد حرکت ضرور کرتے ہیں، لیکن ان کی حرکت پیداوار کی صورت میں نمودار نہیں ہوتی اور جب تک حرکت پیداوار کی صورت میں نمودار نہ ہو، تب تک محنت مزدوری کے زمرے میں نہیں گنی جا سکتی، بلکہ ایسی حرکتیں تفریح کے نام سے نوازی گئی ہیں۔ کھیل کود، ناچ گانا، ناٹک سوانگ، ادب، مصوری وغیرہ تفریح کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ کام کاج سے فرصت تفریح کو جنم دیتی ہے، اس لئے زندگی کے لئے بنیادی نہیں، بلکہ اضافی قدر کی حامل ہوتی ہے۔

خاندان کا جوان مرد تفریح کرنے کے بجائے کھیتوں، کارخانوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرکے پیداوار حاصل کرتا ہے۔ خاندان کی جوان عورت چولھے چوکے میں لگی رہتی ہے۔ برتن مانجھتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے۔ یوں اپنی حرکات سے جوان مرد کی معاون ہوتی

پیداوار کو انسان کی بنیادی ضرورت خوراک کے طور پر استعمال کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے جوان عورت کی حرکات بھی پیداوار کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں کلرک، اُستاد، انجینئر، ڈاکٹر، سپاہی، پولیس، کان کن، ڈرائیور، زراعتی ماہرین اس زنجیر کی کڑیاں شمار ہوتی ہیں۔

لیکن جب زندگی کے بنیادی لوازم، خوراک کو استعمال کرنے کا وقت ہوتا ہے، تو خاندان کے سب افراد واحد دسترخوان پر ایک ایسی خوراک چٹ کر جاتے ہیں، جس کو حاصل کرنے کے لئے جوان مرد اور جوان عورت کے سوا خاندان کے کسی اور فرد کی محنت مشقت شریک نہیں ہوتی۔ شریک ہوتی بھی ہے تو بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔

ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے خاندان کے بڑے بوڑھے عام طور پر بیمار رہا کرتے ہیں۔ حکیم، وئید یا ڈاکٹر اُن کے لئے دوائیاں تجویز کرتے ہیں۔ دوائیاں حاصل کرنے کے لئے پیداوار کا بیشتر حصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے موجودہ دَور میں عام خاندان میں دوائیاں استعمال کرنے کی توفیق پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں خاندان کے باقی افراد کم قلیل غذا پر قناعت کرنے

ہیں، لیکن بیمار اشخاص کی زندگی بچانے کے لئے اپنی محنت کا بہت بڑا حصّہ بیماروں کی ضروریات پر صرف کرنے سے کتراتے نہیں۔

ویسے بھی اچھّی خاصی صحت اور نشو نما کے لئے بچوں کی خوراک میں دودھ، مکھن، گوشت و پھل کا ہونا ضروری ہے، اس لئے خاندان میں بچوں کی پرورش کے لئے ایسی خوراک کسی صورت میسر رکھی جاتی ہے، جب کہ خاندان کے باقی افراد رُوکھی سُوکھی پر قناعت کرتے ہیں۔

اِنسانی جنس کے افراد میں واحد فرد کی مادّی ضروریات کو نظرانداز کرکے دوسرے کسی فرد کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کا احساس، پیار، محبت اور مامتا جیسے جذبوں کو جنم دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس احساس کو اِنسانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پس ثابت ہوتا ہے کہ انسانی خاندان میں ہر فرد چاہے کام کرتا ہے یا کام نہیں کرتا ہے، کو بحساب ضرورت (EACH ACCORDING TO NEED) مادی ضروریات کو پورا کرنیکا اصول قائم ملتا ہے۔ اس اصول میں کوئی بھی آنا کانی خاندان کے افراد کے مابین رشتوں، ناطوں کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیتا ہے، اور خاندان کی وحدت برقرار نہیں رہتی۔ خاندان جو اِنسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔

خاندان میں کشیر خوار بچے جب تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاتے تب تک خاندان کا کوئی بھی فرد اُن سے کسی بھی قسم کی محنت مشقت کی توقع نہیں رکھتا ہے، لیکن جوں جوں بچے بڑے ہو جاتے ہیں، توں توں اُن سے حسبِ طاقت محنت مشقت کرائی جاتی ہے۔ پہلے پہل چھوٹے موٹے کام میں ہاتھ بٹانے پر لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اور بڑے ہوئے تو بازار سے سودا سلف لانے کے کام پر لگائے جاتے ہیں، اور ذرا بڑے ہوئے تو کھیتوں، کارخانوں میں کام پر مامور کیے جاتے ہیں۔ محنت مشقت کا بوجھ اُنکے کندھوں پر بتدریج سن اور تندرستی کے لحاظ سے بڑھایا جاتا ہے۔ بچے کام کرنے سے احتراز کریں، تو خاندان کے لاڈلے ہونے کے باوجود ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے محنت مشقت کے خوگر بنائے جاتے ہیں۔ بچے بالغ ہوں اور ڈانٹ ڈپٹ، مارپیٹ کے باوجود محنت مشقت کرنے سے جی چرائیں تو ان مرحلوں پر خاندان کے دیگر افراد یعنی والدین اپنے ہی خون کو دھتکارنے سے ہچکچاتے ہیں، بلکہ محنت مشقت نہ کرنے کے جرم میں آن کو خاندان سے خارج کرکے خاندان کی ضمانت سے محروم کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

طرزہ ... خاندان کے افراد میں کوئی فرد اپاہج ہو،

سرطی سودائی ہو یا کسی اور معقول وجہ سے محنت مشقت کرنے کے لائق نہ ہو، تو خاندان کے باقی سب افراد اس کی کوتاہی درگذر کرکے اُس کو بدستور خاندان کا فرد گردانتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں خاندان کا کوئی بھی فرد ایسے ناکارہ فرد کے تئیں مادی لوازم، شفقت یا پیار سے محروم کرنے کا خیال تک دل میں پیدا نہیں ہونے دیتا۔

حسب طاقت محنت مشقت کرنے کا اصول خاندان کی فضا میں بغیر کسی بیرونی دباؤ کے قایم ملتا ہے۔ خاندان کا بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت کمزور ہونے کے باوجود اپنی اوقات بھر محنت مشقت کرتے رہتے ہیں۔ بوڑھا مرد آنگن میں ساگ سبزی اُگاتا ہے۔ گھر کے لئے راشن، پانی اکٹھا کرتا ہے، یا کوئی چھوٹا موٹا کام (چپیداری، دستکاری وغیرہ) کرکے خاندان کی مجموعی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

بوڑھی عورت گھر کے کام کاج (برتن مانجھنا، کپڑے دھونا، ساگ سبزی کترنا وغیرہ) میں مقدور بھر بہو کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ بچے سنبھالتی ہے، تاکہ بہو بیوٹلے چوکے میں بغیر کسی روک کے لگی رہے۔ یوں بہو کی محنت مشقت کا بار کم کرنے کا باعث بنتی ہے

خاندان کے افراد کام کرنے کے قابل ہو کر بھی کام کرنے سے احتراز کرلیں، تو خاندان کا خاندان تنگ دستی اور بھوک کا شکار ہونے لگتا ہے۔ پیداواری رشتوں پر آنچ آجانے سے محبت، شفقت اور ممتا جیسے پیارے ناتے، مادی رشتوں کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں، بلکہ خاندان کے افراد کے مابین، نفرت، عداوت کو جنم دیتے ہیں، کبھی یہ نفرت، عداوت بچوں کو ماں سے جدا کرتی ہے۔ کبھی خاوند کو بیوی سے جدا کرتی ہے اور کبھی بہن کو بھائی سے جدا کرتی ہے۔ غرضیکہ انسان کو انسان سے جدا کرتی ہے۔

خاندان کی وحدت اور افادیت کو مدِنظر رکھ کر اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ خاندان میں افراد کے مابین حسبِ استعداد (حسبِ طاقت) محنت و مشقت [WORK ACCORDING TO CAPACITY] کا اصول قائم رہتا ہے، جہاں کہیں اس اصول میں کمی بیشی واقع ہو جاتی ہے، تو خاندان اپنی وحدت برقرار نہ رکھ کر منتشر ہو جاتا ہے۔ خاندان جو انسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہوتا ہے۔

ارتقاء کے اوّلین لمحے سے زندگی اپنا وجود برقرار رکھنے کی خاطر کائینات میں رواں قوت سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں کائینات پر مسلط اصولوں کی پیروی کرنے پر مجبور رہے۔ پرندہ ہوا پر حاوی اصولوں کی پیروی کرنے پر مجبور رہے۔ مچھلی پانی پر حاوی اصولوں کی پیروی کرنے پر مجبور رہے۔ صحرائی جانور صحرا پر حاوی اصولوں کی پیروی کرنے پر مجبور رہے، اور ٹنڈرا (برفانی علاقے) میں زندگی ٹنڈرا پر حاوی کائینات کے اصولوں کی پیروی کرنے پر مجبور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں مختلف ماحول کے تحت زندگی نے مختلف انداز اپنائے ہیں۔ زندگی کی اس خاصیت کو انگریزی زبان میں [ADOPTATION] کا نام دیا گیا ہے۔

انسان بھی بہ حیثیت زندہ مخلوق کائینات کے اصولوں کی پیروی کرنے کی سعی پر مجبور ملتا ہے، جہاں چرند پرند، کیڑے مکوڑے، حیوان درندے کم ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے غیر ارادی طور پر

کائنات کے اصولوں کی پیروی میں جکڑے نظر آتے ہیں، جسے انگریزی زبان میں [INSTINCTS] سمجھا جاتا ہے، وہاں انسان فطرتاً قوتِ ذہن کا مالک ہونے کی صورت میں کائنات کے صحیح اٹل اصولوں کی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اس مشق کو انسان نے مذہب کے نام سے سنوار کر آفاقی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، تاکہ انسان بلا کسی پس و پیش کے کائنات پر مسلط اصولوں کی پیروی کر کے خطروں سے دوچار ہونے کی نوبت کم پہنچے۔ یوں مذہب کائنات کی جانکاری کے طفیل بذاتِ خود کائنات میں رواں اصولوں کا ترجمان ہوتا ہے۔

چونکہ علم کی مقدار تحقیق، تجربہ اور جانکاری کی مدّت اور مقدار سے براہِ راست وابستہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی جنس کے ارتقاء کے دوران کائنات کی تدریجی تحقیق اور تجربے کی بنا پر مزید مذاہب کرۂ ارض پر وقتاً فوقتاً نمودار ہوتے گئے۔ ہر نیا مذہب، پرانے مذہب کی کوکھ سے جنم لے کر، پرانے مذہب کے سطحی اور غلط اندازوں کو رد کر کے کائنات کی مزید جانکاری اور تحقیق و تجربہ پر مبنی علم سے آراستہ ہوتا ہے اور مزید وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ کائنات کی مزید جانکاری اور تحقیق و تجربے کے سامنے فرسودہ مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے۔

نیا مذہب پرانے مذہب کے ہر اصول کی نفی نہیں کرتا، بلکہ پرانے مذہب کے اُن اصولوں، اندازوں کو رد کرتا ہے، جو انسان نے کائنات کی صحیح جانکاری کی کمی کے باعث اپنے ادراک اور اندیشوں کو مطمئن کرنے کے لیے گڑھ لیئے تھے، لیکن تحقیق اور تجربے کی کسوٹی پر کھرے ثابت ہونے والے پرانے مذہب کے اصولوں سے نئے مذہب کو بدستور لیس رکھتا ہے۔ یہ تسلسل انسانی جنس میں مذہب کے ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے۔ کاش ہر مذہب سچائی کا واحد دعویدار ہونے کا مرتکب نہ ہوتا، تو شاید مختلف مذاہب کے پیروکار ہونے کی تہمت پر انسانی جنس میں استحصال کی لعنت برقرار نہیں ملتی۔

صفحۂ ہستی پر مذہب کو آشکار کرنے کے دو انداز ملتے ہیں ایک انداز روحانیت سمجھا جاتا ہے۔ اس انداز کے تحت انسان اپنی سوچ بروئے کار لاکر کائنات کی کھوج کرتے اور جانکاری پانے کی سعی کرتا ہے، اور دوسرا انداز مادی سمجھا جاتا ہے،

جس کے تحت انسان کائنات کی کھوج اور جانکاری سے برآمد اُصولوں و انکشافات کو اپنانے کی سعی کرتا ہے۔
تحقیق اور منطق کا سہارا لیا جائے تو مذہب کو انسانی جیں پر آشکارا کرنے کے دونوں انداز مادیت (MATERIA-LISM) کے احاطے میں محصور ملتے ہیں۔ روحانیت سوچ کی دین ہے سوچ انسان میں موجود دماغ کی خاصیت ہے۔ دماغ مادے کے ان گنت خلیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ ان مادّے کے خلیوں میں ذرا سا تغیر و تبدل انسان کی سوچ میں تغیر و تبدل پیدا کرتا ہے۔ یوں ایک پڑھا لکھا دانشور، فلسفی یا روحانیت کا علمبردار دماغ پر معمولی سی چوٹ لگنے پر یا کسی اور وجہ سے دماغ میں موجود مادے کے خلیوں میں تبدیلی ہونے پر چشم زدن میں اَن پڑھ جاہل میدیل ہو جاتا ہے، اور جہاں کہیں تبدیلی شدید نوعیت کی ہو، زری، سودائی بھی بن سکتا ہے۔ اس نئی حالت میں ایسے انسان آفاقی نظریے کے تحت بدستور روحانیت سے منسلک انسان کی سوچ، سمجھ، منطق کی تذلیل کرنے کے مترادف۔

گو اِنسان کی سوچ انسان کے دماغ میں موجود مادے کی خلیوں (CELLS) کی خاصیت اور ردِ عمل کا اظہار ہے، لیکن مادیت کے اصولوں کی جکڑ سے مبرا ہوتی ہے۔

مثلاً ... ... کمرے میں لیٹا، نیند میں بے سدھ اِنسان اپنی سوچ کے دوش پر کبھی آکاش میں اُڑتا پھرتا ہے۔ کبھی پاتال کی سیر کر آتا ہے۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے تو کسی کو باہوں میں سمیٹ کر پیار کرتا ہے۔ بھوک محسوس ہو، تو چاندی کی روٹیاں اور موتیوں کے چاول چبا جاتا ہے۔ چٹکیوں سے نئے اِنسان بناتا ہے اور اشاروں سے موت کے گھاٹ اُتارتا ہے۔ کیا کچھ نہیں کر پاتا اِنسان اپنی سوچ کے صدقے ... ... ! تخیل و تصور انہی محرکات کے خوبصورت نام ہیں۔

لیکن جونہی اِنسان کی سوچ عمل کے حدود میں داخل ہونے لگتی ہے، تو مادیت کے اصولوں میں جکڑی جاتی ہے۔ اب کے کمرے میں لیٹے نیند میں بے سدھ اِنسان کو جاگ کر آکاش میں اُڑنے پھرنے کے لیے ہوائی جہاز، راکٹ جیسی مادی چیزوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پاتال کی سیر کرنے کے لیے کلوں، مشینوں سے صرف

کا سینہ چیرنا پڑتا ہے۔ لڑنے جھگڑنے کے لیئے مادے سے بنے اپنے بازوؤں کو استعمال کرنا پڑتا ہے، اور پیار کرنے کے لیئے دوسرے انسان کے مادی جسم کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ بھوک مٹانے کے لیئے چم چم کرتے چاندی موتی جیسی قیمتی ذاتوں کے بجائے معمولی گیہوں، چاول جیسی مادی ذاتوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے نئے انسان پیدا کرنے کے لیئے تولید کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور مارنے کے لیئے دوسروں کے زور کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے غرضیکہ اپنے ہر سوچ کو، ہر تخیل کو، ہر تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیئے مادیت اور مادیت کے اصولوں پر مبنی ماحول کا پابند رہنا پڑتا ہے۔

مادیت کے حدود میں آکر مذہب مختلف حرکات میں بٹ جاتا ہے، جس میں عبادت کی روپ ریکھائیں، کھانے پینے کے طور و اطوار، شادی بیاہ کے رسم و رواج، لباس کی ساخت و بناوٹ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ یوں مذہب بذات خود کلچر کہیئے، تہذیب کہیئے یا سنسکرتی کہیئے کی جکڑ میں آجاتا ہے۔ اسی لیئے انسانی جنس میں کہیں کرسچین کلچر پروان چڑھا۔ کہیں

ہندو کلچر نمودار ہوا، اور کہیں اسلامی کلچر وجود میں آ گیا۔

چونکہ کھانے پینے کے طور و اطوار، شادی بیاہ کے رسم و رواج، لباس کی ساخت، بناوٹ وغیرہ جیوگرافیائی حالات سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے مختلف جیوگرافیائی خطوں نے بھی کلچر کا احاطہ کر رکھا ہے جیسے یورپین کلچر، ہندوستانی کلچر، عربی کلچر وغیرہ۔ اب تو رسل و رسائل کی مہربانی سے ایک ہی جیوگرافیائی خطے کے مختلف حصوں میں مختلف کلچر ابھار رہے ہیں، جیسے پنجابی کلچر، بنگالی کلچر، کشمیری کلچر، سندھی کلچر وغیرہ ... ... مختصراً آج کل کے زمانے میں کلچر کو گنے چنے جزئیات میں قید کرنا ناممکن ہے۔ کلچر کی رنگا رنگیاں کلچر کے ارتقاء کی تفسیر ہیں۔

انسانی جنس کا کوئی مرد (نر) فطرت سے مجبور، دور چلتی عورت (مادہ) کی چال ڈھال، ساخت اور مست خرامی محسوس کر کے عشق میں مبتلا ہونے کی سوچ میں بندھ جاتا ہے۔ سوچ شدید ہو، تو دور چلتی عورت سے تولید کے مراسم پیدا کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی عورت کے خد و خال، اس مرد کی ماں یا بہن کی صورت میں نمایاں ہوں، تو

دُنیاوی آداب کے صدقے اُس کی سوچ چشم زدن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صرف عشق کے جذبات ہی کافور نہیں ہو جاتے، بلکہ ندامت اور پشیمانی کی لہریں بھی اُس کے وجود کو ڈبونے لگتی ہیں، گو نزدیک آنے پر عورت کی ساخت، چال ڈھال یا مست خرامی میں کوئی بنیادی تبدیلی رُونما نہیں ہوتی۔ پھر بھی مرد کی اپنی سوچ بظاہر کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اُس کے حرکات پر پابندی عاید کرتی ہے۔

کسی ظاہری مادی وسیلے کی مداخلت یا روک کے بغیر انسان کی حرکت کو انسان کی اپنی ہی سوچ سے قابو میں کرنے کی تفسیر کو اخلاق کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انسان کی سوچ پر روک نہ رہے تو انسان کی حالت کو خطروں سے دوچار ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔

انسانی جنس پر مذہب مسلّط کرنے کے لئے اخلاق واحد وسیلہ ہے، جس کی بناء پر انسان کو بغیر کسی مادی مداخلت کے مذہبی اُصولوں کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب میں مختلف اخلاقی قدریں رواں ملتی ہیں۔

جہاں کسی مذہب میں گوشت خوری اخلاقاً بُری سمجھی جاتی

ہے، وہاں کسی اور مذہب میں گوشت خوری اخلاقاً ثواب کا درجہ پا چکی ہے، لیکن دونوں صورتوں میں کوئی بھی مذہب کائنات کے ایک اٹل اُصول یعنی انسانوں کی بنیادی ضرورت خوراک کو کھانے کی حرکت کو نہیں جھٹلا پایا ہے۔ اس لئے ہر مذہب میں خوراک چاہیئے مختلف قسم کی ہو، کھانا کھلانا انسان کے لیئے اخلاقاً جائز ہے۔

کسی مذہب میں شادی (نر و مادہ کا تولیدی ملاپ) اگنی کے گرد پھیرے لگانے کے بعد اخلاقاً جائز مانی جاتی ہے۔ جب کہ کسی دوسرے مذہب میں صرف قول و اقرار کے بعد ہی اخلاقاً جائز سمجھی جاتی ہے، لیکن دونوں صورتوں میں کائنات کے اٹل اُصول یعنی نر و مادہ کے جنسی ملاپ سے گریز نہیں۔

غرضیکہ ہر مذہب کے اُصول سطحی اخلاقی اختلافات کے باوجود انسانی جسم پر حاوی کائنات کے اٹل اُصولوں کی نفی نہیں کر پاتے۔ اس لحاظ سے مذہبی رسم و رواج، طور طریقے، اخلاقی قدریں حقیقت کے حامل نہیں بن پاتی ہیں۔

مختلف مذاہب اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے اپنے

اندازوں، اندیشوں کا سہارا لے کر مختلف قسم کے اخلاق کے پابند ضرور ہوتے ہیں، لیکن انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بھی ارتقاء پذیر ہیں۔ جہاں کہیں بیوہ کی شادی اخلاقاً ناجائز خیال کی جاتی تھی، وہاں اب بیوہ کی شادی اخلاقاً جائز سمجھی جاتی ہے۔ کسی مذہب میں عورت پر پردے کی پابندی اخلاقاً لازم تھی، وہاں اب عورت پر پردے کی پابندی کو زندگی کی دوڑ میں مرد کے دوش بدوش چلنے کے لئے درگذر کیا جاتا ہے، اور اخلاقاً برا نہیں سمجھا جاتا۔

ہمارے برصغیر میں رائج مذاہب سے وابستہ بچوں کی موجودگی میں جنسی ملاپ اور تولید کے موضوع پر گفتگو کرنی اخلاقاً حرام تھی، لیکن وقت کا ساتھ دینے کے لئے انہیں بچوں کو طبعی ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کے دوران غیروں سے ایسے موضوعات پر تعلیم حاصل کرنے کو اب اخلاقاً حلال سمجھا جاتا ہے، کیونکہ کائینات کی مزید کھوج اور جانکاری سے ثابت ہو چکا ہے کہ صفحۂ ہستی پر انسان کی بقا کے لئے ڈاکٹری، طبعی تعلیم اہم نوعیت کی حامل ہے۔

ایسے بدلتے زمانے کے بدلتے تقاضوں کے زیر اثر مختلف

مذاہب کے اندازوں اور اندیشوں پر مبنی اخلاقی قدریں آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر کائیناتی (UNIVERSAL) قدروں کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔

عام خاندان میں بھی کسی نہ کسی مذہب کا تسلط پایا جاتا ہے اور ہر فرد پر لازم ہوتا ہے کہ مذہبی اصولوں کی پیروی اخلاقی فرض سمجھ لیں۔ لیکن جہاں خاندان کے بڑے، بوڑھے دن رات مذہبی عبادت میں مشغول ملتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے یا موت کو قریب پانے کی وجہ سے یا شاید پیداواری وسیلوں پر وقت صرف کرنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے وہاں خاندان کے جوان افراد، یعنی جوان عورت اور جوان مرد محنت مشقت اور دیگر اقتصادی مصروفیات کی وجہ سے اس اخلاقی فرض کے تئیں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے نہیں پائے جاتے۔ ننھے منّے بچّے نہ تو مذہب کا مطلب جانتے ہیں اور نہ اخلاق کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ مذہبی رسم و رواج اور آداب اُن کو کھیل کھلواڑ محسوس ہوتا ہے۔ یوں خاندان میں مختلف افراد مذہب کے تئیں مختلف سوچ اور حرکت کا اظہار کرتے ہیں۔ خاندان کے

مابین اِن کوتاہیوں پر بحث مُباحثہ ہوتا ہے۔ کئی بار شکوہ شکایات کی نوبت آتی ہے۔ لیکن پیار و محبت کے حُدود ٹوٹنے کی نوبت نہیں آتی، اور نہ ہی ان کوتاہیوں کی بُنیاد پر کسی قسم کا مادی استحصال کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ خاندان کی وحدت کو نظر انداز کر کے مذہبی اندیشوں پر مُبنی سوچ کو اِجتماعی مادی رشتوں کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔

مذہبی نُکتہ نظر کا لحاظ رکھا جائے تو یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ کائینات کا خالق کسی بھی بندے کو کسی دوسرے بندے کے کہنے سُننے پر تخلیق نہیں کرتا۔ خالق اپنی اور صرف اپنی مرضی سے بندوں کی تخلیق کرتا ہے۔ خالق اور بندے کے درمیان رشتہ خالص انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ خالق کے سامنے ہر بندہ صرف اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ خالق کی رضا چاہیئے بندے کو رکھے چاہے نہ رکھے۔ اِس لئے کوئی بھی انسان، پیر، درویش رِشی منی خالق اور اُس کے بندے کے مابین انفرادی رشتے میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ مباحثہ کر سکتا ہے۔ بُرا بھلا سمجھا سکتا ہے، لیکن سزا و جزا دینے کا حق نہیں رکھتا۔ سزا و جزا دینے کی

حرکت کا مُرتکب ہو، تو خالق کے تئیں توہین کا مُرتکب بنتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو زک پہنچانا یا کسی قسم کا مادی جذباتی استحصال کرنا ہر مذہب کے بنیادی اُصولوں کے خلاف گردانا گیا ہے۔

جب تک خاندان کے مختلف افراد مذہبی اندیشوں، اور ارادوں پر مبنی انفرادی سوچ کو ایک دوسرے پر ٹھونسنے کا مُرتکب نہیں ہوتے، نہ ہی ایسی سوچ کے تحت ایک دوسرے کی مادی ضرورتوں پر وار کرتے ہیں، تب تک خاندان کی وحدت قائم رہتی ہے۔ خاندان جو انسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔

یہ حقیقت بار بار واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ زندگی کا دار و مدار غذا پر ہوتا ہے، جس کو کھا کر ہضم کر کے زندگی اِس قابل رہتی ہے کہ کائینات کی کٹھور طاقت سے لڑ جھگڑ کر اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔ اس لیئے غذا کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیئے انسان کو جہاں جو چیز میسر ہوئی اور جس کو ہضم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اِنسان نے خوراک کے طور پر اپنالی۔

صحرائی خطوں میں زرخیز زمین کی کمی اور آبپاشی کی سہولیات نایاب ہونے کی وجہ سے کِس قسم کی فصل پیدا کرنی مُشکل ہے۔ اس لیئے صحرا کے انسان نے پرندوں، درندوں کو اپنی غذا کی بنیاد بنا کر اس مُشکل کا حل ڈھونڈھ نکالا۔ گوشت، دوُدھ، انڈے، خوراک کے ضروری جُز قرار دیئے گئے۔

میدانی مرطوب علاقوں میں زرخیز زمین اور پانی کی کمی نہ تھی۔ ایسے علاقوں میں گھاس پھوس اور درخت، پودے با افراط اُگ آتے ہیں۔ اس لیئے میدانی مرطوب علاقے کے انسان کی خوراک

کے ضروری جُز گھاس پھُوس کے بیج مثلاً چاول، گیہوں، مکّی، جَو وغیرہ اور درختوں کے پھل مثلاً سیب، ناشپاتی، آم، کیلے وغیرہ اور ننھّے مُنّے پودوں کی پتیاں اور پھل مثلاً ساگ، سبزی، پالک، ٹماٹر، گوبھی وغیرہ قرار پائے۔

سمندروں، جھیلوں کے کنارے بسنے والے انسان آبی جانوروں مثلاً مچھلی، کیکڑے، سیپیاں، جھینگے اور کچھوے وغیرہ سے بطور خوراک مانوس ہے۔

کرۂ ارض پر کچھ خطے ایسے بھی ملتے ہیں، جہاں انسان اپنی خوراک پُورا کرنے کی مجبوری کے تحت زہریلے سانپ، مینڈک اور کیڑے مکوڑے کھانے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ کبھی زمانے میں افریقہ اور نیوگنی کے انسان اپنے ہی ہم جنس انسان کو بطور خوراک استعمال کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ ان انسانوں کو اب تک آدم خور (CANNIBALS) کے خوفناک نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

رسل و رسائل کی ترقی کے ساتھ ساتھ دُنیا کے مختلف جیوگرافیائی خطوں کے انسان ایک دوسرے کے اتنا نزدیک آ چُکے ہیں کہ مختلف خطوں کی مخصوص خوراکیں آپس میں گڈمڈ ہوتی جیلی

جا رہی ہیں۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ صحرائی خطّے کا
انسان میدانی مرطوب خطّے کے انسان کی خوراک کا متمنی رہتا ہے، اور
میدانی مرطوب علاقے کا انسان سمندروں، جھیلوں کے پاس رہنے
والے انسان کی خوراک کا خواہاں۔

ایک ہی جنس سے وابستہ ہونے کے احساس نے انسان کو
اپنا ہی ہم جنس خوراک بنانے سے باز رکھا۔ زہریلے اثرات اور
بیماریوں کی جانکاری نے اُس کو کئی قسم کی خوراک رد کرنے پر
مجبور کیا۔ ساتھ ساتھ موسمی، زراعتی علم کی پیش رفت نے اُس کو
اس قابل بنا دیا کہ اپنی زندگی بدستور برقرار رکھنے کے لئے نئی
اچھی مقوی، لذیذ خوراک دریافت کرتا رہے۔

اِرتقاء کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ خوراک اِستعمال کرنے
کے طور و اطوار بھی ارتقاء پذیر ہوتے گئے۔ کہاں تو پُرانے وقتوں
کا انسان، حفظانِ صحت سے نابلد، زمین پر درندوں کی طرح
اکڑوں بیٹھ کر، مٹی سے لت پت، خوراک سے شکم کی آگ بجھانے
میں عار نہیں کرتا تھا، اور کہاں اُس آدم کی اولاد، کا نباتات
کی مزید جانکاری کے طفیل نمک مصالحوں سے آراستہ چٹپٹے پکانے

پکوان شفاف خوبصورت پلیٹوں، تھالیوں میں انداز سے سجاتا ہے، اور درندوں کی طرح اکڑوں بیٹھنے کے بجائے کرسیوں، صوفوں کے آرام دہ گدوں پر بیٹھ کر نوش فرماتا ہے۔ کچھ نفاست کے دیوانے، چھری کانٹوں کے بغیر غذا کو چھوتے تک نہیں کہ مبادا ہاتھ کی رطوبتیں، پسینہ وغیرہ خوراک کو آلودہ نہ کر دیں۔

عام خاندان میں بھی خوراک کی مختلف صورتیں اور کھانے کے مختلف آداب ملتے ہیں۔ جہاں خاندان کے بڑے بوڑھے مذہبی آداب کے صدقے کئی قسم کی خوراک مثلاً گوشت، مچھلی کو چھوتے تک نہیں کہ مبادا کسی جیو جنتو کی جان لینے کے مرتکب نہ سمجھے جائیں، اس لئے صرف دال سبزی پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ وہاں جوان افراد بڑے بوڑھوں کی دقیانوسی سوچ کو رد کر کے گوشت، مچھلی استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ صحت برقرار رکھنے کی خاطر بچوں کی خوراک میں انڈے، چوزے خوراک کا ضروری جز سمجھا جاتا ہے، چاہے خاندان کے باقی افراد انڈے، چوزوں سے پرہیز کرتے ہوں، ذائقے کا لحاظ رکھ کر بھی خاندان کے افراد مختلف قسم کی خوراک استعمال کرتے ہیں۔ بچے میٹھے

کا دلیوانہ ہے، تو بچّی نمکین کی دلیوانی۔ کسی کو چاول سے رغبت ہے، تو کوئی صرف روٹی کو پسند کرتا ہے، کوئی چٹ پٹے مصالحے دار کھانے پر مرمٹتا ہے، اور کسی کو مصالحے سے عاری کھانے میں ہی مزا ملتا ہے۔

خاندان کے کچھ افراد (بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت) روائیتوں کو مدِ نظر رکھ کر فرش پر آلتی پالتی مار کر اپنے ہاتھوں سے غذا کھانے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن خاندان کے کچھ اور افراد (جوان مرد اور جوان عورت) میز، کرسیوں کے دلدادہ ڈائننگ ٹیبل پر چھری، کانٹے استعمال کر کے کھانا کھا لیتے ہیں۔ بچوں کا کیا! جہاں چاہا، جیسے چاہا، کھانا نگل لیتے ہیں۔ کبھی بیٹھے بیٹھے، کبھی کھڑے کھڑے اور کبھی گھومتے پھرتے...... !

لیکن متضاد پسند اور آداب کے باوجود خاندان کے افراد خوراک کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متنفر نہیں ہوتے، نہ ایک دوسرے کو کسی قسم کا گزند پہنچاتے ہیں، نہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند پر حاوی ہو کر کسی قسم کا مادی، جذباتی استحصال کرنے کا مرتکب ہوتے رہتے۔ استحصال کے مرتکب ہوں، تو

خاندان کا شیرازہ بکھرنے میں دیر نہیں لگتی۔ خاندان جو فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔ ہاں ... ... ایسی خوراک پر مجموعی پابندی عائد ہوتی ہے، جس کے استعمال سے فرد کی جسمانی حالت خطروں سے دو چار ہونے لگتی ہے، جیسے شراب، تمباکو، زہر اور اس قبیل کی چیزیں ہیں۔

لباس کو انسانی زندگی کو بدستور برقرار رکھنے کے لئے بنیادی چیز نہیں لیکن جیوگرافیائی یا موسمی حالات کی دست برد سے انسان کو محفوظ رکھنے کے لئے بنیادی چیز کی قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے انسان نے ہر اس چیز سے اپنے عریاں بدن کو ڈھانپنے، چھپانے کی کوشش کی، جو اس کو دستیاب ہوئی۔ برفانی علاقوں میں درندوں کی کھالیں، سمور اور اون اس کا لباس بن گیا، تاکہ کڑاکے کی سردی سے جسم کو محفوظ رکھ سکے۔ صحرائی علاقوں میں ایسا لباس زیب تن کیا جس سے گرمی کی شدت اور سورج کی جھلسانے والی شعاعیں رد کی جا سکیں۔ میدانی مرطوب علاقے میں روئی، ریشم اور گھاس پھوس سے بنے لباس استعمال کئے، جس سے نمی روکی جا سکے۔

لباس کی کانٹ چھانٹ انسان کی ساخت اور حرکات تشکیل

کرتی ہیں۔ جہاں دوڑنے کے لئے نیکر، جانگیئے موزون رہتے ہیں،
وہاں لیٹنے، سونے کے لئے چغے آرام دہ ثابت ہوتے ہیں، اور
محنت مشقت کرنے کے لئے کوٹ، پتلون، پاجامے، کرتے اور
ایسے ہی مناسب کانٹ چھانٹ کے لباس، مخصوص قسم کے کام
کے لئے مخصوص نوعیت کے لباس کی ضرورت پڑتی ہے۔ خلاؤں میں
پرواز کے لئے اسٹرونانٹ کا لباس اور سمندروں کی تہہ کھنگالنے کے
لئے غوطہ خوری کا لباس۔

لباس کی کانٹ چھانٹ کسی بھی ڈیزائن کی ہو، لیکن اس کی
ایجاد انسان نے اپنے آرام کو ملحوظ خاطر رکھ کر کی ہے۔ چونکہ مختلف
خطوں میں مختلف جیوگرافیائی حالات اور تکنیکی پیش رفت کی وجہ سے
مختلف لباس وجود میں آ گئے۔ اس لئے انسان کے ذہن میں لباس
کے تئیں مختلف مفروضے جنم لیتے گئے، جیسے قومی لباس، مذہبی لباس
یا نسلی لباس کے مفروضے ... ... !

لیکن رسل و رسائل کی پیش رفت نے ہر خطے کے لباس ہر
دوسرے خطے میں پہنچا دئے۔ صحرائی علاقے کا لباس پہاڑی علاقے
پر چڑھ آیا۔ میدانی علاقوں کا لباس برفانی علاقوں میں وارد ہوا۔

ان کے میل ملاپ سے اَن گِنت قسم کے لباس تشکیل پاتے گئے اور کُرۂ ارض کے ہر خطے میں مختلف قِسم کے لباس پروان چڑھتے گئے۔ اس لئے لباس کا کوئی خاص نظریہ، جیسے کہ مذہبی لباس، قومی لباس یا نسلی لباس انسانی جینس پر ٹھونسنا غلط ہے، غیر قدرتی ہے، [illegible]عمالی عناصر کی پیداوار ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ لگاتار ایک ہی قِسم کی کانٹ چھانٹ کا لباس [illegible]مال کرنے کے دوران انسان اُس خاص لباس کا خوگر ہو جاتا ہے اور انسان کے ذہن میں مفروضے کو جنم دیتا ہے کہ اُس کی شخصیت انفرادیت اُس ایک قِسم کے لباس میں برقرار رہ سکتی ہے، حالانکہ حقیقت میں انسان کی شخصیت، انفرادیت لباس کی دین نہیں، بلکہ اُس کی سوچ، سمجھ اور حرکات کی دین ہوتی ہے۔

عام خاندان کے افراد بھی مختلف قِسم کے لباس استعمال کرنے کے عادی پائے جاتے ہیں۔ خاندان کے بزرگ (بوڑھی عورت اور بوڑھا مرد) ضعیف العمر ہونے کے کارن گھر سے باہر کبھی کبھار ہی قدم رکھتے ہیں۔ نہ ہی کبھی سنجیدہ کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ اس لئے مذہبی مفروضے یا قومی مفروضے کے اثر کی وجہ سے

خاص لباس میں اپنے آپ کو پابند رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں
جبکہ جوان مرد اپنے کام کی موزونیت کا لحاظ رکھ کر مختلف قسم
کا لباس پہننے پر مجبور ہوتا ہے، جو نہ مذہبی سمجھا جا سکتا ہے اور
نہ قومی گردانا جا سکتا ہے۔ مشینوں، کارخانوں میں کام کرتا ہو، تو
ڈانگری، جینز وغیرہ ایسے ہی چست لباس استعمال کرتا ہے۔ کلرک
بیوروکریٹ ہو، تو کوٹ، پتلون اور ٹائی کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں
رکھتا۔ ڈرائیور، پائیلٹ ہو، تو پرواز کے کپڑے پہنتا ہے، اور جو
کہیں دہقان، زمین دار ہو، تو جانگیے، کچھے کا سہارا لے کر پانی
کیچڑ کو روندھتا رہتا ہے۔

بچوں کو سکول کی وردی (UNIFORM) پہننی پڑتی ہے جس
کا انتخاب بچوں کی تربیت کو زیر نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مختلف
تربیتی شعبوں میں مختلف قسم کے لباس زیب تن کرنے پڑتے ہیں۔
کہیں نیکر، بش شرٹ اور کہیں شلوار، سکرٹ۔

جوان عورت جہاں چولھے چوکے میں لباس کو ذرہ بھر بھی
اہمیت نہیں دیتی۔ وہاں چولھے چوکے کی دنیا سے باہر آتے ہی
خوبصورتی اور مرکز نگاہ بن جانے کے لئے کبھی ہندوستانی، کبھی یورپین

اور کبھی جاپانی لباس کو قومی، مذہبی، نسلی لباس پر ترجیح دینے میں عار نہیں کرتی۔

یوں بدلتے موسم، بدلتے کاروبار اور انفرادی سوچ کے برتے پر خاندان کے مختلف افراد لباس کے مختلف انداز اپنانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر موجود ہر خاندان میں لباس کے تئیں کوئی سنجیدہ نظریہ رواں نہیں ملتا۔ ہوتا بھی ہے تو سرسری سا سطحی، جس کو بنیاد بنا کر خاندان کے افراد آپس میں کسی قسم کا مادی استحصال نہیں کرتے نہ ہی کسی جذباتی استحصال کے مرتکب ہوتے ہیں، کریں تو خاندان کی وحدت برقرار نہیں رہ پاتی۔ خاندان — جو انسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔

کائنات میں انسانی جنس مختلف قوموں، نسلوں یا مذاہب سے وابستہ ہونے کے باوجود جسمانی، طبعیاتی (BIOLOGICAL) ساخت کی بناء پر ایک ہے۔ انسان کے اجزاء، سوچ، حرکت، ضرورتیں ایک ہوتی ہیں۔ قدرتی طور پر ہر انسان دوسرے انسان کے ہم پایہ ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کو محنت مشقت (جسمانی کام) یا سوچ سمجھ (دماغی کام) یا مجموعی طور پر کام کی نوعیت کے لحاظ سے درجوں میں بانٹنے کی کوشش غیر قدرتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ آرام دہ کمروں، دفتروں میں کرسی، صوفوں پر براجمان انسان جنہیں دنیاوی زبان میں بیوروکریٹ (BEUROCRAT) اور ٹیکنوکریٹ (TECHNOCRAT) جیسے بھاری بھرکم ناموں سے نوازا گیا ہے۔ دماغی کام کے مفروضے کے تحت اونچے درجے کے حقدار بنائے جاتے ہیں، اور اونچے درجوں کو ظاہر کرنے کے لئے اُن کو مادی سہولیات سے نوازا جاتا ہے۔ رہنے کو ایرکنڈیشنڈ مکان،

گھومنے پھرنے کے لئے کاریں، موٹریں اور دیگر سہولیات کے لئے اُن کے کام کا کافی معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ جب کہ کھیتوں، کارخانوں میں دھوپ، گرمی، بارش، سردی سے براہ راست دوچار انسان یعنی کسانوں، مزدوروں کو جسمانی کام کے مفروضے کے تحت نچلا درجہ دیا جاتا ہے، اور نچلے درجوں کی نشاندہی، اُن کو مادی سہولیات سے عاری رکھنے کے ذریعے کی جاتی ہے۔ رہنے کو جگی جھونپڑیاں تک نہیں ہوتی ہیں۔ گھومنے پھرنے کے لئے بائیسکل، بیل گاڑی تک نہیں ہوتی اور دیگر مالی سہولیات کیا، زندگی قایم رکھنے کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی اُن کے کام کا پورا معاوضہ نہیں ادا کیا جاتا۔

غیر جانبداری سے منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے، تو ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی حرکات کو دماغی محنت یا جسمانی محنت کے زمروں میں بانٹنا استحصالی عناصر کی جانی بوجھی کوشش ہے۔

ٹرک یا بس یا معمولی سی بیل گاڑی کا ڈرائیور جیسے جسمانی کام کرنے والے کا درجہ دیا جاتا ہے، جہاں اُس کے بازو، ہاتھ، پیر، اعضاء جسمانی کام میں جُتے رہتے ہیں۔ وہاں اُس کی سوچ بھی گاڑی، بس، ٹرک چلانے کی حرکات، سڑک کے پیچ وخم کا

تجزیہ اور راہ گیروں کے رجحان کا برابر مطالعہ کرتی جاتی ہے۔ انسانی
دماغ سے کام نہ لے، تو گاڑی چلانا تو کجا خود بھی ایک قدم نہیں چل سکتا
بالکل ایسے جیسے دفتر میں بیٹھا بیوروکریٹ، ٹیکنوکریٹ جب تک
ہاتھوں سے، انگلیوں سے اور دیگر حیاتی اعضاء کو استعمال کرکے فائلیں
اُلٹ پلٹ کر صفحوں کے صفحے سیاہ کرکے، نقشے نقوش بنانے کی
جسمانی حرکات کے بغیر کوئی بھی دماغی کام انجام نہیں دے پاتا۔
انسان کی کسی بھی حرکت، محنت یا کام کے منبع کا مدو دالعیہ
ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے، تو نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب تک انسان
کے جسم کے مختلف اجزاء اور جسم میں موجود دماغ ہم آہنگ ہو کر
سوچ اور تحریک سے ایک ساتھ نہیں گزرتے، تب تک پیداوار وجود میں
نہیں آتی یا سیدھے سادھے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی قسم کا
کام ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ انسان کا زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔
یہ صحیح ہے کہ بیوروکریٹ، ٹیکنوکریٹ اپنے وجود کی طاقت
کا بیشتر حصہ دماغی کام پر صرف کرکے مادے کی مختلف صورتوں یعنی
خام مواد کو کل پرزوں میں ڈھالنے کے منصوبے (PLAN)
بنا کر انسانی جنس کی پیش رفت کا باعث بنتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کسان، مزدور اپنے وجود کی طاقت کا بیشتر حصّہ جسمانی کام پر صرف کر کے دھرتی سے خام مواد کھود کر پگھلا کر، ڈھال کر حاصل نہ کر لیں، تو ٹیکنو کریٹ، بیوروکریٹ صرف اپنے دماغی کام کے برتے پر انسان کی محنت کو حقیقت کے رُوپ میں ڈھال کر کسی بھی قسم کی پیداوار حاصل نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ ہی انسانی جنس کی پیش رفت کا باعث بن سکتے ہیں۔

ہاں .. .... کسان، مزدور، غیر ارادی طور پر زمین سے خام مواد فراہم کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں، لیکن بیوروکریٹ، ٹیکنوکریٹ جیسے دماغی نہج نہ ہونے کے کارن خام مواد کو کل پُرزوں میں ڈھالنے کے منصوبے نہ بنا سکیں، تو اُس صورت میں بھی کسان، مزدور، جسمانی کام کرنے کے باوجود اپنی محنت کو حقیقت کا رُوپ دے کر پیداوار حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی انسانی جنس کی پیش رفت کا باعث بن سکتے ہیں۔

محنت چاہیئے دماغی نوعیت کی سمجھی جائے یا جسمانی نوعیت کی، دونوں صورتوں میں پیداوار کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ اِس لئے کسی بھی فرد نے کے تحت ... ک ... پیداوار کی صورت

میں نمودار ہو کر انسانی جنس کی پیش رفت کا باعث بنتی ہے، تب تک ایک ہی درجے میں گردانے کی حامل ہے۔

موجودہ انسانی معاشروں میں محنت کو دماغی اور جسمانی مفروضوں میں محصور رکھنے کے علاوہ ایک ہی نوعیت کی محنت (جسمانی یا دماغی) کو بھی ان گنت درجوں میں بانٹ کے رکھنے کی استحصالی کوشش ملتی ہے۔ دماغی کام کرنے کے مفروضے کے تحت جہاں کلرک کو نچلا درجہ عطا کیا جاتا ہے، وہاں اس نوعیت کا کام کرنے کے لیئے ہیڈ کلرک کو اونچا درجہ عطا کیا جاتا ہے، اور جسمانی کام کرنے کے مفروضے کے تحت جہاں کلینر کو نچلے درجے میں گردانا جاتا ہے، وہاں ڈرائیور کو ایسی ہی نوعیت کا کام کرنے پر اونچے درجے میں گردانا جاتا ہے۔

حتیٰ کہ ہو بہو ایک جیسا کام کرنے والے افراد میں بھی جذباتی یا دوسرے الفاظ میں غیر منطقی درجہ بندی ملتی ہے، جہاں ہسپتالوں وغیرہ میں مریضوں کا بول براز چھونے، اٹھانے والے افراد کو بھنگی، اچھوت سمجھ کر نچلا درجہ دیا جاتا ہے، وہاں یہی کام کرنے والی نرس ڈاکٹر کو (مریض کا بول براز چھونے، ٹیسٹ کرنے وغیرہ)

پر اونچے درجے کا سمجھا جاتا ہے ۔ مذاق تو یہ ہے کہ ایسے مفروضے اُسی انسان کے ایجاد کردہ ہیں، جو اپنی مخصوص جسمانی ساخت کی بنا پر بول براز کو روز چھونے، اُٹھانے کا مرتکب ہوتا ہے ۔

عام خاندان میں بھی مختلف افراد، مختلف نوعیت کے کام میں جُٹے ملتے ہیں ۔ بچے اور نواسے، غلاموں کی طرح بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں ۔ بوڑھا مرد آنگن کی کیاریوں میں کسان، مزدور بن جاتا ہے ۔ بوڑھی عورت دائی بن کر بچوں کو پالتی پوستی ہے ۔ جوان مرد کسی ادارے کا سپروائزر ہو سکتا ہے یا کسی کارخانے کا ٹیکنو کریٹ، لیکن اُس سپروائزر یا ٹیکنو کریٹ کی بیوی یعنی خاندان کی جوان عورت رسوئیا بن کر چولہا چوکا سنبھالتی ہے ۔ ماشکی بن کر پانی لاتی ہے ۔ دھوبن بن کر کپڑا لتا دھوتی ہے، لونڈی بن کر سارے خاندان کی سیوا میں لگی رہتی ہے ۔ اس کے باوجود کام کی نوعیت کے مفروضے کے تحت خاندان کے افراد کو درجوں میں نہیں بانٹا جاتا، نہ ہی کام کے برتنے پر کسی افراد پر کسی بھی قسم کا جذباتی، مادی استحصال کیا جاتا ہے، بلکہ جوان افراد بزرگوں کا احترام کرتے ہیں ۔ مرد عورتوں کی عزت کرتے ہیں، اور عورتیں بچوں مردوں سے پیار

مانتہا برتتی ہیں ۔

انسان کی پیدائش براہ راست ماں کی کوکھ سے ہونے کی بناء پر انسانی جنس میں ماں کو سب سے افضل درجے کا مالک مانا جاتا ہے۔ حالانکہ مائیں ایک اچھوت، بھنگی کی طرح خاندان کے دیگر افراد یعنی بچوں اور بیماروں کا بول براز چھوٹے، اٹھانے سے احتراز نہیں کرتیں۔ لیکن خاندان کے کسی بھی فرد کے ذہن میں، ماں کے اصلی رتبے کے متعلق شک کا شائبہ تک نہیں ملتا۔

صاف ظاہر ہے کہ انسانی جنس کے خاندان میں کام کاج کی نوعیت یعنی جسمانی کام یا دماغی کام کے مفروضوں پر مبنی درجے سرے سے نہیں ملتے، نہ ان مفروضوں کی آڑ میں کسی قسم کا مادی استحصال کیا جاتا ہے۔ کیا جائے تو خاندان کے افراد ایک دوسرے سے متنفر ہو کر وحدت برقرار نہیں رکھ پاتے، اور خاندان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ خاندان جو انسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہے۔

کرۂ ارض پر مختلف خطوں میں مختلف جیوگرافیائی موسمی حالات مسلّط ملتے ہیں۔ اس لئے انسان کو ارتقاء کے دوران مختلف حالات (ماحول) کا سامنا کرنا پڑا۔

گھنے جنگل سے پُر خطر خطوں میں انسان کو جنگلی درندوں سے بچاؤ اور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے اونچے درختوں پر چڑھنے میں اپنی عافیت دکھائی دی۔ ظاہر ہے درخت پر چڑھنے کے لئے بازوؤں کو زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے، اس لئے ایسے خطوں میں رہائش پذیر انسان کی قوت کا بیشتر حصّہ بازوؤں اور بازوؤں کے گرد پھیلے اعضا میں منتقل ہوتا گیا۔ پیڑھی در پیڑھی ایک خاص تناسب کا انسان پروان چڑھتا گیا۔

پہاڑوں اور ٹیلوں پر بسنے والے انسان کو اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنے کے لئے کشش ثقل کا توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہاں کے انسان کی کمر اور سینے میں کچھ انوکھی صفتیں نمودار ہوتی گئیں۔

اور انسان کا جسم گھٹی گھٹی صورت اختیار کرتا گیا۔

پتھریلے ریتیلے صحراؤں میں انسان کو خوراک حاصل کرنے کے لئے درندوں، جانوروں کے مقابل دوڑ لگانے کی ضرورت آن پڑی۔ ایسے خطوں کے انسان کی ٹانگیں لمبی اور مضبوط ہوتی گئیں۔ قد آور انسان پروان چڑھنے لگے۔

برفیلے علاقوں میں سورج کی کرنیں، برف کی چمکیلی سفید سطح سے پلٹ کر آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ روشنی کی چکا چوند سے بچنے کے لئے انسان اپنی آنکھیں موندے رکھنے پر مجبور تھا۔ لگاتار مشق نے انسان کی آنکھ کو تناسب بدلنے پر مجبور کر دیا۔

گرم خطوں میں سورج کی سخت تمازت میں انسان کی جلد جھلس کر سیاہ اور کھردری ہو گئی، اور برفیلے علاقوں میں سردی اور نمی کے زیر اثر انسان کی جلد گوری اور ملائم رہی۔

مختلف خوراک میں غذائیت کے مختلف عناصر کی وجہ سے کہیں انسان کے بال گھونگھریالے ہو گئے اور کہیں آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ مختلف انداز میں ابھر آیا۔

یوں جیوگرافیائی حالات کے زیر اثر دنیا میں کہیں منگول نسل،

کہیں حبشی نسل اور کہیں آریائی نسل نمودار ہوگئی۔ یہ ثابت ہے کہ انسان کی نسل جینز (GENES) کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ لیکن جینز (GENES) بذاتِ خود ارتقاء کے دوران صدیوں جغرافیائی ماحول کے زیر اثر پروان چڑھ کر موجودہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اور موجودہ دور میں بھی رسل و رسائل کی بیش رفت کے صدقے ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر مخلوط نسل کی صورت میں آشکارا ہو رہے ہیں۔ مختلف نسلوں کے میل ملاپ سے ہزاروں نئے اقسام ارتقاء پذیر ہو رہے ہیں۔ اب تو حالت یہاں تک آ گئی ہے کہ کسی بھی انسان کی صحیح اور بنیادی نسل کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

انسان کسی بھی نسل سے تعلق رکھتا ہو، لیکن ماننا پڑتا ہے کہ طبیعیاتی علم کی روشنی میں ہر انسان کی بنیادی ساخت ایک ثابت ہوئی ہے۔ اعضاؤں کی تعداد، دماغ کی حالت، خون کی گردش، معدے انتڑیوں کی صفت، دل و جگر کی خاصیت، ناک نقشے کی صورت انسانی جنس میں ایک ہے، لیکن کائنات کی ہر اور جنس سے الگ۔ اسی وجہ سے انسانی جنس انفرادیت کی حامل

ہے۔ ہاں ... اگر خدوخال اور رنگ کو خاطر میں لایا جائے تو
عیاں ہو جاتا ہے کہ اس نوعیت کی خاصیتیں بنیادی نہیں، بلکہ سطحی
نوعیت کی ہیں۔ گورے رنگ کے انسان کے مسکن کشمیر کا فرد کالے
لوگوں کے مسکن مدراس میں وقت گذرنے کے ساتھ کالا رنگ اختیار
کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی بنیادی ساخت میں کوئی تبدیلی رونما
نہیں ہوتی۔

کائنات کی نیرنگیاں دیکھئے کہ مادے کی کسی بھی ذات یا جنس
کے جز ایک ہی سانچے میں ڈھلے نہیں ملتے، حتیٰ کہ ایک ہی نسل
سے وابستہ انسان بھی ہوبہو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کروڑوں
اربوں انسانوں میں جڑواں بچے (TWINS) سطحی شکل و شباہت
میں ایک جیسے وجود پالیں تو پالیں، لیکن ان کے جسم کی اندرونی ساخت
ہوبہو ایک جیسی نہیں ہوتی۔ عام طور پر ہر انسان منفرد
خدوخال کا مالک ملتا ہے۔

عام خاندان میں بھی ہر فرد منفرد سانچے میں ڈھلا ملتا ہے
بوڑھا مرد لمبا ہو، تو اس کا بیٹا (جوان مرد) ناٹا ہو سکتا ہے
جوان عورت گورے رنگ کی ہو، تو اس کے بچے سانولے رنگ

کے ہو سکتے ہیں۔ بوڑھی عورت کی آنکھیں چھوٹی لمبوتری (منگول نسل) ہوں، تو اُس کے بیٹے (جوان مرد) کی آنکھیں گول مطول (آریائی نسل) ہو سکتی ہیں۔ بہن یعنی بچی کی ناک چپٹی (اسکیمو نسل) جیسی ہو، تو بھائی یعنی بچے کی ناک لمبی اور تیکھی (رومن نسل) جیسی ہو سکتی ہیں۔ لیکن مختلف شکل و صورت کے باوجود خاندان کے افراد کے مابین صورت (نسل) و شباہت (رنگ) جیسی سطحی علامات کے برتے پر کوئی تضاد نہیں ملتا۔ نہ ہی اِن ظاہری سطحی علامات کی وجہ سے کسی قسم کا مادی یا جذباتی استحصال کیا جاتا ہے، کیا جائے، تو ظاہر ہے خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہ نہیں سکتے۔ نہ ہی خاندان کی وحدت برقرار رہ سکتی ہے۔ خاندان، جو اِنسانی جنس کے فرد کی وجودیت کا ضامن ہوتا ہے۔

اِنسان کا انسان سے رابطے کا بنیادی ذریعہ انسان کی آواز ہے۔ زبان، ہونٹ، حلق اور سانس کے مدو جزر سے انسان کے گلے میں کچھ آوازیں جنم لیتی ہیں۔ یہ آوازیں کم و بیش کئی اور زندہ جنس مثلاً چرند پرند، درندے، حیوان اور کیڑوں مکوڑوں میں بھی جنم لیتی ہیں، لیکن ارتقا کی جس منزل پہ انسان آج ہے، اُس کی بدولت انسان کے گلے سے برآمدہ مختلف قسم کی آوازیں (صوتی اِشارے) دُنیا میں ہر اور زندہ جنس سے برآمد مختلف قسم کی آوازوں (صوتی اِشاروں) سے تعداد میں زیادہ برآمد ہوتی ہیں۔ ساتھ ساتھ انسان اپنے طاقت ور ذہن، سوچ اور یادداشت کی بنا پر اِن مختلف صوتی اِشاروں کے گٹھ جوڑ PERMUTATION COMBINATION سے اَن گنت صوتی اشارے تشکیل کرنے کے قابل ہے۔ یوں انسان اَن گنت صوتی اِشاروں کی مدد سے کائنات میں موجود اَن گنت چیزوں، حرکتوں کی نشاندہی کر پاتا ہے۔ آواز کے دوش پر اپنی

سوچ کو دوسرے انسان کی سوچ سے منسلک کر سکتا ہے۔ کبھی بھی حادثے یا واقعے پر ہر دوسرے انسان سے رابطہ بڑھا سکتا ہے اور رابطے کے ذریعے اجتماع کی صورت اختیار کر کے کائنات کی زبردست سے زبردست قوت، حرکت، جنس یا ذات کو اپنے تابع کرنے کا مقام حاصل کر چکا ہے۔

ارتقاء کی کسی منزل پر کسی انسان نے کہیں لکڑی کے کُندے کو پانی میں بہتا دیکھا۔ لکڑے کے کندے کو ایسی خاص حرکت میں گرفتار پاکر انسان نے بے اختیار اس لکڑے کے کُندے کو "کِشتی" کے صوتی اشارے میں قید کیا۔

ارتقاء کی ایسی ہی کسی منزل پر کسی اور انسان نے کہیں اور کسی ایسے ہی لکڑی کے کُندے کو پانی میں بہتا پایا۔ لکڑی کے کُندے کو ایسی خاص حرکت میں گرفتار پاکر اس انسان نے بلا کچھ سوچے سمجھے گلے میں سے برآمد "بوٹ" (BOAT) کے صوتی اشارے سے نوازا۔

ارتقاء کی ایسی ہی کسی منزل پر کہیں کسی اور انسان نے اس جیسے واقعے میں گرفتار لکڑے کے کُندے کو "ناؤ" کے

صوتی اِشاروں میں پابند کردیا۔

لیجیے، اِرتقاء کے کئی مرحلوں پر کئی انسانوں نے کائینات کے ایک ہی واقعے یا تفسیر کو کئی مختلف جگہوں میں مختلف صوتی اشاروں کے گٹھ جوڑ میں پابند کر کے مختلف زبانوں کی داغ بیل ڈال دی۔

طبیعیاتی بنیاد پر صوتی اعتبار سے ہر انسان کی ساخت کم و بیش ہر دوسرے انسان کے ہم پایہ ہے، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کے گلے میں سے جتنی اور جیسی آوازیں بر آمد ہوتی ہیں۔ کم و بیش اتنی اور ایسی ہی آوازیں ہر دوسرے انسان کے گلے میں سے بھی بر آمد ہوتی ہیں۔ دراصل زبان (LANGUAGE) انسان کے گلے میں سے بر آمد ہوئے صوتی اِشاروں (آوازوں) کے سوا کچھ بھی نہیں۔

رسل و رسائل کی پیش رفت نے دُنیا کے ہر خطے کو ہر دوسرے خطے کے اِتنا نزدیک لا کھڑا کیا ہے، کہ مختلف خطوں کے انسانوں کی مختلف زبانیں ایک دوسرے کے نزدیک آ کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر، اور نئی زبانوں کی تشکیل

کر رہی ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں مختلف زبانوں کا تعارف اور گٹھ جوڑ ایک نئی زبان "اُردو" کی صورت میں نمودار ہوا۔

انسانی جنس کے گلے سے برآمد مختلف صوتی اشاروں (آوازوں) کو انفرادی پہچان دینے کی خاطر دُنیا کے مختلف خطوں میں مختلف علامات ایجاد ہوئیں، جنہیں عُرفِ عام میں حروفِ تہجی (ALPHABET) کا نام عطا کیا گیا۔ ان حروفِ تہجی کے گٹھ جوڑ کو مجموعی طور پر ظاہر کرنے کے لیے رسم الخط (SCRIPT) وُجود میں آگئے، اور اس طور مختلف خطوں میں مختلف حروفِ تہجی کی بنا پر مختلف رسم الخط عام ہوئے۔

جہاں عربی رسم الخط میں "ا" جیسی علامت، دیوناگری رسم الخط میں "अ" جیسی علامت اور رومن رسم الخط میں "A" جیسی علامت ہر انسان کے گلے سے برآمد ایک ہی قسم کے صوتی اشارے (آواز) کو ظاہر کرتے ہیں۔ یا ایک ہی صوتی اشارے کے مختلف حروفِ تہجی ظاہر کرتے ہیں، وہاں ان حروفِ تہجی کی بناوٹ یا صورت میں کوئی پہلو یا عنصر ایسا نہیں ملتا، جن کی بناء پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ

اِن مختلف زبانوں کے رسم الخط میں کسی قسم کا ارتقائی، علاقائی یا
جذباتی رشتہ کارفرما ہے، ماسوائے ایک صوتی اشارے (آواز) کے
لیکن ہر انسان کی زبان (LANGUAGE) ہر دوسرے انسان کی
زبان کے رسم الخط میں ڈھالی جا سکتی ہے۔ جیسے عربی رسم الخط میں
"بھگوان" کو دیوناگری رسم الخط میں "भगवान" یا رومن رسم الخط
میں "BHAGWAN" لکھا جا سکتا ہے۔ تینوں لفظ انسان کی
ایک ہی آواز (صوتی اشارے) کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے
کہ تینوں لفظ ایک دوسرے سے شکل و صورت میں ہونے کے باوجود
انسانی جنس کے گلے میں سے برآمد ہوئی آواز اور لب و لہجہ کے حامل ہیں لیکن
دُنیا کی ہر اور جنس سے الگ۔ یہی وجہ ہے کہ ارتقاء کے اولین لمحے سے
آج تک زبان کے ذریعے اِنسانی جنس کا رابطہ کرۂ ارض پر موجود
کسی اور جنس سے نہیں ہو سکا ہے۔
چونکہ انسان کو انسان کے نزدیک لاتے ہیں، سمجھتے ہیں،
ہم آہنگ ہوتے ہیں یا اِجتماع کی صورت حاصل کرتے ہیں زبان واحد
بنیادی وسیلہ ہے۔ اس لئے اِستحصالی عناصر کبھی مادری زبان کی
دُھائی دے کر، کبھی قومی زبان کا راگ الاپ کر، اور کبھی مذہبی زبان کا

شورش کھڑا کرکے انسان کو انسان سے دُور کرتے ہیں۔ حالانکہ زبان انسان کی ایجاد ہے۔ زبان کی ایجاد انسان تھیں، جو زبان کے نام پر انسان کی حالت کو خطروں سے دوچار کرنے کی نوبت آئے۔

مادری زبان کی سلیس تعریف یوں ہے کہ انسان کی ماں جس زبان میں اپنے نوزائیدہ بچے کو لاڈ پیار کرے، لوری سُنائے، ہنسے کھیلے، یعنی جس زبان کے سہارے ماں بچے کو پروان چڑھائے۔ ظاہر ہے، ماں اپنی زبان کا سہارا لے کر بچے کو پالتی پوستی ہے۔ اس لئے مادری زبان سے مُراد ماں کی زبان ہوتی ہے۔

ایک بنگالی زبان بولنے والا مرد کسی طور جرمن زبان بولنے والی عورت سے شادی کرتا ہے۔ اس صورت میں جرمن زبان بحیثیت مادری زبان بولنے والا فرد بنگالی زبان بحیثیت مادری زبان بولنے والے خاندان کا رُکن بن جاتا ہے، تو کیا سمجھا جائیگا کہ ایسے مِلاپ سے پیدا ہوئے بچے کی مادری زبان جرمن زبان ہوگی، جب کہ خاندان کے دیگر افراد معہ بچے کے باپ کے بنگالی زبان سے بحیثیت مادری زبان منسلک ہیں، یا اس بچے کی مادری زبان بنگالی سمجھی جائے گی۔ حالانکہ بچے کی ماں جرمن زبان سے بحیثیت مادری زبان منسلک ہے، اور غیر ارادی

طور پر بچے کو پالنے پوسنے، لاڈ پیار کرنے اور لوری سنانے کے لئے جرمن زبان کا سہارا لیتی ہے۔

یہ سمجھنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیئے کہ زبان پر مادری زبان کی تہمت لگانا غیر قدرتی ہے، اور غلط ہے۔ زبان بچّے کے ساتھ پیدا نہیں ہوتی بلکہ پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ اُسے سکھائی جاتی ہے، چاہے کوئی بھی زبان سکھائی جائے۔ شرط یہ ہے کہ بچّہ اپنے خیالات اور جذبات سکھائی ہوئی زبان کی وساطت سے ظاہر کرنے کے قابل بن جائے۔

قومی زبان کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے، اِس کے علمبردار بھی استحصالی ارادوں سے مبّرا نہیں۔ روزگار حاصل کرنے کے لئے کسی قوم کا انسان ہجرت کر کے کسی دوسری قوم کے علاقے میں بس جاتا ہے۔ دوسری قوم میں اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے اپنی قومی زبان کو پس و پشت ڈال کر دوسری قوم کی زبان کے نرغے میں اپنی عافیت پاتا ہے۔ قدرتی طور پر اُس کی زبان بدل جاتی ہے۔ ہمارے اپنے مُلک میں باہر سے آئی ہوئی قوموں نے یہاں کی قوم میں رائج زبانوں کو اپنایا۔ یوں عربوں نے، ایرانیوں نے ہندوستان میں رائج زبانوں کو اپنانے میں کوئی پس و پیش ظاہر نہیں کیا۔ اس لئے انسان کی زبان کو قومی زبان کی حصار میں قید کرنا مصنوعی ہے، غلط ہے۔

سطحی جذبات کو بالائے طاق رکھ مذہبی زبان کا حدود اربعہ ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے، تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی مذہب جہاں کسی خطے میں نازل ہوا، تو وہاں رہنے والے انسان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اُس خطے میں پہلے سے رائج زبان میں نازل ہوا۔ مذہبی زبان عام زبانوں سے الگ درجے کی حامل ہوتی یا آفاقی ہوتی، تو دُنیا میں پہلے سے رائج زبانوں کا سہارا لینے پر مجبور نہ ہوتی۔ عیسائیت نازل ہوئی تو اس علاقے میں ہیبرو (HEBREW) زبان پہلے سے رائج تھی۔ اسلام نازل ہوا، تو اُس خطے میں عربی زبان پہلے سے رائج تھی۔ ہندو ازم نازل ہوا تو ہندوستان میں ویدک زبان پہلے سے رائج تھی۔ اسی لئے مذہب کے نام پر کسی بھی زبان کو مذہبی رُتبہ عطا کرنا غلط ہے۔ ناسمجھی کی دلیل ہے۔ مذہب جہاں انسان کی سوچ و فکر سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے، وہاں زبان اس سوچ و فکر کو انسان کے ذہن نشین کرنے کے لئے صرف ایک وسیلہ ہے۔ "اللہ" لکھنے کہنے سے یا "परमात्मा" لکھنے کہنے سے یا "GOD" لکھنے کہنے سے خالق کے رُتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ہی خاص مذہب کسی خاص زبان کو کوئی آفاقی صِفت بخش دیتا ہے۔

عام خاندان میں بھی مختلف افراد مختلف زبان و مختلف رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ بزرگ عبادت کے لئے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں، جسے عام طور پر مذہبی زبان سمجھا جاتا ہے۔ بچے سکولوں، کالجوں میں سائنسی و ادبی زبان سے مانوس ہوتے ہیں۔ جوان مرد، دفتر، کارخانے میں تکنیکی، دفتری زبان کا پابند رہتا ہے، لیکن قربت میں رہنے کی وجہ سے خاندان کے مختلف افراد کی مختلف زبانیں کو ایک دوسرے کی زبانوں کا اثر قبول کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری گھریلو عورتیں انگریزی زبان سے نابلد ہونے کے باوجود نیلے رنگ کو بلیو (BLUE)، تھالی کو پلیٹ (PLATE)، جوتے کو بوٹ (BOOT)، وقت کو ٹائم (TIME) اور ایسی ہی کئی اور زبانوں کے الفاظ کو استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتیں۔ لیکن مختلف زبانیں بولنے رہنے کے باوجود خاندان کا کوئی بھی فرد زبان کے معاملے میں دوسرے کسی اور فرد سے متنفر نہیں ملتا ہے۔ نہ زبان کو بہانہ بنا کر زک پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ نہ ہی مادری زبان، قومی زبان یا مذہبی زبان کے معروضوں کو مادی، جنسی یا جذباتی رشتوں پر بالادستی حاصل ہونے دیتا ہے۔ بلکہ ضرورت

کے پیشِ نظر سب زبانوں کے سیل سے ایک پیاری سی زبان
وجود پاتی ہے، جو خاندان کی روزمرّہ کی زبان بن جاتی ہے۔
اور یوں زبان کے نام پر استحصال کی لعنت سے ہر خاندان
اپنی وحدت برقرار رکھ کر بدستور انسانی جنس کے فرد کی
وجودیت کا ضامن رہتا ہے۔

انسانی خاندان چاہے کسی بھی مذہب، قوم یا نسل سے وابستہ ہو، کا غیر جانبدارانہ تحقیقی، علمی، تجرباتی تجزیہ کرنے کے دوران کچھ اٹل حقیقتوں کی نشاندہی ہوتی ہے، جن کے برتنے پر خاندان اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے، اور انسانی فرد کی وجودیت کا ضامن رہتا ہے۔

(ا) خاندان میں افراد کے مابین ذاتی یا نجی ملکیت کا نہ تو کوئی تصوّر ہوتا ہے، نہ کوئی قانون، ہوتا ہے، تو صرف فرد کی بنیادی ضرورت کا احساس ہوتا ہے یا مشترکہ ملکیت کا تصور۔

(ب) خاندان کے افراد کو بلا کسی لحاظ و تمیز زندگی کو برقرار رکھنے کے لوازمات یعنی روٹی، کپڑا، مکان حسب ضرورت میسر رہتے ہیں۔

(پ) خاندان میں افراد حسب استعداد اپنی محنت مشقت کو پیداوار کی صورت میں تبدیل کرتے ہیں اور مجموعی پیداوار حسب ضرورت استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، جو کوئی بھی فرد محنت مشقت سے احتراز کرتا ہے، تو خاندان میں رہنے کا حق کھو دیتا ہے۔

(ت) خاندان میں افراد کے مابین مذہب کے نام پر کسی بھی قسم کا مادّی استحصال نہیں ہوتا۔

(ث) خاندان کے افراد میں محنت مشقت کی نوعیت کے لحاظ سے نہ کوئی جذباتی درجہ بندی (ذات پات) برتی جاتی ہے، اور نہ کوئی منطقی (دماغی، جسمانی) درجہ بندی برتی جاتی ہے۔ نہ ایسے مفروضوں پر کسی قسم کا مادی اِستحصال کیا جاتا ہے۔

(ش) خاندان کے افراد کے بیچ مادری زبان، قومی زبان یا مذہبی زبان جیسے مفروضوں کی بناء پر کسی بھی قسم کا مادی یا جذباتی اِستحصال نہیں ہوتا ہے۔

(ج) خاندان میں انسان کے تناسب نسل یا رنگ کو نہ تو توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے، نہ ان اندیشوں کے برتے پر کسی قسم کا مادّی یا جذباتی استحصال کیا جاتا ہے۔

(چ) خاندان میں قومی، مذہبی یا نسلی لباس کے تئیں کسی قسم کے اندیشے نہیں ہوتے اور نہ ایسے اندیشوں کی بنیاد پر کوئی مادی، جذباتی اِستحصال ہوتا ہے۔

خاندان چونکہ کائناتی اصولوں کی بنا پر انسانی جنس کے

معاشرے (WHOLE) میں اکائی (UNIT) کا حامل ہے۔ اس لئے انسانی جنس کے معاشرے (WHOLE) پر وہی اصول مسلّط ملنے چاہئیں جو انسانی خاندان (UNIT) پر مسلّط ملتے ہیں۔ تب اور صرف تب انسانی جنس کا معاشرہ قدرتی معنوں میں انسانی جنس کا ترجمان ہو سکتا ہے۔

خاندان پر مسلّط اصول، رشتے، قانون کسی بھی فلسفے، مذہب یا نظام کے نام سے نوازیں جائیں، لیکن اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ ان ہی اصولوں، رشتوں، قانونوں کا اطلاق صحیح معاشرے کی تعمیر کر سکتا ہے، اور انسانی جنس کے فرد واحد کی وجودیت کا ضامن رہ سکتا ہے۔ دنیا میں ان اصولوں کو آخری شکل دینے کا سہرا ایک نامور فلاسفر کارل مارکس کے سر ہے۔ اسلئے دوسرے الفاظ میں ایسے نظام کو مارکسزم اور اشتراکیت (COMMUNISM) کے ناموں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

گو ہر مذہب، ہر نسل اور ہر قوم میں ان اصولوں کی بنیاد پر خاندان کا وجود قایم ملتا ہے، لیکن خاندانوں کے اجتماع یعنی معاشروں میں ان اصولوں کا اطلاق نہیں ملتا ہے۔ کہیں کوئی خاندان مذہب کے نام

پر دوسرے خاندان کا قلع قمع کر رہا ہے (ہندو، مسلم فساد)، کہیں کوئی خاندان قوم کی دُھائی دے کر شب خون مار رہا ہے (جرمن، انگریز جنگ) کہیں نسل کی تہمت لگا کر وار کر رہا ہے (امریکن ریڈ انڈین جنگ) اور کہیں رنگ روپ کے نام پر استحصال کر رہا ہے (گورے، کالے کی لڑائی) جہاں یہ حربے کارگر نہیں ہو پاتے، تو وہاں زبان کا ہوا کھڑا کر کے ایک ہی نسل، مذہب یا قوم کے خاندانوں کے مابین زک پہنچانے سے بھی باز نہیں رہتا۔ خود ہمارے برصغیر میں پنجابی زبان اور سندھی زبان کا جھگڑا (پاکستان) ہندی زبان اور مرہٹی زبان کا جھگڑا (ہندوستان)، اردو زبان اور بنگالی زبان کا جھگڑا (بنگلہ دیش) سنہالی زبان اور تامل زبان کا جھگڑا (سری لنکا) وغیرہ، اس قبیل کے بیّن ثبوت ہیں۔ حالانکہ ان خطوں کے لوگ ہر لحاظ سے ایک جیسے معاشروں کے افراد ہیں۔

لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں کرۂ ارض پر حقیقی انسانی معاشرے (WHOLE) قائم ملتے ہیں۔ کائنات کے اٹل اصولوں یعنی انسانی خاندان (UNIT) پر مسلط اصولوں کی نفی کرتے ہیں۔ اس لئے فطرتی اور حقیقی معاشرے نہ ہو کر استحصال کی لعنت سے مبرا نہیں۔

استحصال قوم کی دُہائی دے کر کیا جائے یا مذہب کی آڑ لے کر کیا جائے۔ نسل کا فتنہ کھڑا کر کے کیا جائے یا زبان کا شوشہ پیدا کر کے، لیکن ہر صورت میں استحصال کی زد انسان کی مادّی ضرورتوں پر مرکوز ہوتی ہے، کہیں انسان کی روٹی، روزی چھینی جاتی ہے، کہیں جھگی جھونپڑی پر شب خون مارا جاتا ہے، اور کہیں براہِ راست انسان کے جسم و جان پر وار ہوتا ہے، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لفظ "استحصال" ہر صورت انسان کی مادّی ضرورتوں کو غصب کرنا ظاہر کرتا ہے۔

قدرتی طور پر سوال اٹھتا ہے کہ انسان کی زندگی میں استحصال کی کیا اہمیت ہے، اور انسان سے استحصال کن جذبوں کے تحت سرزد ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی کی اور جنس مثلاً چرند پرند، حیوان، درندے، کیڑے مکوڑے وغیرہ استحصال کی حرکت سے مبرّا سمجھے جاتے ہیں۔

زندگی کائینات میں مادی وجود پا لیتی ہے، تو کائینات میں

آوارہ طاقت مثلاً سردی، گرمی، طوفان، سیلاب، کشش ثقل وغیرہ کے درمیان اپنی مخصوص ساخت بدستور برقرار رکھنے کے لئے اپنی قوت صرف کرنے پر مجبور رہتی ہے، اور لحظہ بلحظہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ ساری قوت صرف ہو کے زندگی بدستور اپنی ساخت برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اپنی قوت بحال رکھنے کی خاطر زندگی دوسری اور مادی جنسی کو اپنی خوراک بناتی ہے۔ خوراک ہضم ہو کر قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی قوت بحال کر کے اپنا وجود بدستور برقرار رکھنے کے قابل رہتی ہے۔

یہ صورتحال کائنات کی ہر زندہ جنس پر حاوی ملتی ہے۔ بھیڑ، بکریاں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے گھاس پھوس کو اپنی خوراک بنا کر گھاس پھوس کا وجود ہٹا دیتی ہیں۔ انسان، حیوان اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے بھیڑ، بکریوں کو اپنی خوراک بنا کر بھیڑ، بکریوں کا وجود مٹا دیتے ہیں۔ جراثیم بیکٹریا اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے انسان حیوان کو لقمۂ اجل بنا کر انسان حیوان کا وجود مٹی میں ملا دیتے ہیں، اور گھاس پھوس جراثیم بیکٹریا کو مٹی کی معرفت اپنی خوراک بنا کر جراثیم بیکٹریا اور مٹی کا وجود ہٹا دیتے ہیں۔ غرضیکہ زندگی سے مزین ہر جنس ہر دوسری جنس کا وجود

مٹا کر یا ایک دوسرے کا استحصال کر کے کائنات میں اپنا وجود بدستور برقرار رکھنے میں سرگرداں ملتی ہیں، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کو بدستور رکھنے کی بنیادی صفت مادی استحصال کی تفسیر ہے، اور کائنات کی کوئی بھی زندہ جنس اس حرکت سے مبرا نہیں۔

انسانی جنس میں مادی ضرورتیں محنت مشقت کی دین ہوتی ہیں، اور پیداوار کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ پیداوار، زمین، جائیداد کے صدقے وجود میں آتی ہے۔ زمین، جائیداد کو تختۂ مشق بنا کر انسان اپنی قوت صرف کر کے پیداوار نمودار کرتا ہے، اور پیداوار حاصل کر کے اپنی صرف کی ہوئی قوت بحال کر کے بدستور زندہ رہنے کی طاقت سے لیس رہتا ہے۔ کسی طور انسان کو قوت صرف کرنے کی نوبت نہ آئے، تو انسان کو قوت بحال رکھنے کے لئے پیداوار حاصل کرنے کی خاطر محنت مشقت کرنے پر قوت مٹانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس حقیقے کے تحت استحصالی عناصر بغیر محنت مشقت پیداوار کے حقدار رہنے کی کوشش میں زمین و جائیداد کو ملکیت کے نجی مفروضے میں مقید کر کے انسان کو استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔ یوں بھی انسانی جنس اپنا وجود بدستور رکھنے کے لئے کائنات کی ہر اور جنس

اور طاقت سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ خود غرضی اور کم مائیگی کی انتہا ہو گی کہ انسان اپنے ہی ہم جنس سے رابطے اور سمجھ کے باوجود ملکیت، مذہب، نسل، قوم وغیرہ مفروضوں کے تحت برسرِ پیکار رہ کر انسانی جنس کی مشکلوں میں اضافے کا باعث بنے۔ حالانکہ پیدائش کے مرحلے پر انسان کے پاس اپنے بدن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی طور انسان کے مادّی وسیلے (زمین، جائیداد) استحصال کے حربوں کی زد میں نہ آسکیں تو انسان کا استحصال انسان کے ہاتھوں ممکن نہیں۔ اس لئے استحصال کی لعنت دُور کرنے کے لئے انسانی معاشرے میں ملکیت کا ہر نجی احساس زائل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، یوں نہ کوئی انسان مادّی وسیلوں پر قابض رہ کر کسی اور انسان کا استحصال کر سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی انسان مادّی وسیلوں کی خاطر کسی استحصالی عناصر کے بھینٹ چڑھ سکتا ہے۔ جور و جبر، توپ و تفنگ، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، صفحۂ ہستی کو مٹا نہیں سکتے، لیکن انسان کو ضرور مٹا سکتے ہیں۔ اس انسان کو .... جو اپنے طاقت ور ذہن کے بوتے پر اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔

موجودہ زمانے میں انسانی جنس میں کئی قسم کے معاشرے

قایم ملتے ہیں۔ کسی جگہ تواریخی ارتقاء کے پہلے مرحلے کو طے کرتے ہوئے قبائلی معاشرے قایم ہیں۔ کسی دوسرے خطے میں تواریخی ارتقاء کو طے کرتے ہوئے جاگیردارانہ معاشرے قایم ملتے ہیں، اور کہیں اور ارتقاء کے تیسرے مرحلے کو طے کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ معاشروں کا تسلط ہے۔ صرف کچھ گنے چنے معاشرے ارتقاء کے اگلے تواریخی مرحلے اشتراکیت کی طرف بڑھنے کی سعی کر رہے ہیں۔

تواریخی ارتقاء کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر اس مشکل کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ انسانی جنس کا ہر معاشرہ مرحلہ بہ مرحلہ ارتقائی منزلیں جب تک نہ طے کر پائے، تب تک آخری منزل پر پہنچنا محال ہے، یا یوں بھی واضح کر سکتے ہیں کہ جب تک قبائلی معاشرہ بالترتیب جاگیردارانہ معاشرہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں کے مرحلوں کو پار کر کے یا جاگیردارانہ معاشرہ، سرمایہ دارانہ معاشرہ کے ارتقائی مرحلوں سے نہیں گذر پاتا، تب تک ارتقائی مرحلے کی اگلی منزل اشتراکیت حاصل کرنے سے قاصر ہوگا۔

لیکن ایک نئی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ

انسانی جنس کے ارتقاء کے دوران انسان نے سائنسی تیکنیکی ارتقاء کی بدولت رسل ورسائل کے اتنے وسائل پیدا کیے ہیں کہ کرۂ ارض کے دُور افتادہ مختلف معاشرے جیوگرافیائی روک اور حدود توڑ کر ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر ایک انسانی معاشرے پر ہر دوسرے انسانی معاشرے کا اثر پڑ رہا ہے۔

یورپی معاشروں میں انجینیروں کاریگروں نے برسوں تیکنیکی ارتقاء کے مراحل طے کرنے کے بعد بجلی، موٹریں، ریلیں، ہوائی جہاز اور ہزاروں دیگر مشینیں اور اوزار ایجاد کیے۔ اُن کے ڈاکٹروں، حکیموں نے نسلوں کی کھوج در کھوج کے مرحلے طے کرنے کے بعد بیماریوں کا قلع قمع کرنے کے ہزاروں نئے وسیلے ڈھونڈھ نکالے (SULPHA DRUGS) سلفا ڈرگس اور (ANTIBIOTICS) جیسی زندگی بچانے والی دوائیاں ایجاد کیں۔ اُن کے زراعتی ماہرین نے اَن گنت ناکامیوں اور پیچ در پیچ مرحلوں کے بعد زراعت کے طور اطوار بدل ڈالے۔ نئے پودے اُگائے، نئے بیج پیدا کیے۔ نئی خوراک بنائی۔ اُن کے سائینسدانوں نے صدیوں کی

تگ و دَو کے بعد چاند ستاروں کی دہلیز پر قدم رکھا۔ غرضیکہ وہاں کے انسان نے زندگی سے وابستہ ہر شعبے کے ارتقاء کے کٹھن مرحلوں سے گذر کر آج کے انسان کی زندگی سنوار دی۔

لیکن اپنے برصغیر میں قائم انسانی معاشروں کے افراد کو ارتقاء کے ان کٹھن مرحلوں سے گذرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اپنے برصغیر کے انسان نے انسانی جنس سے وابستہ ہونے کی بناء پر براہ راست یورپی انسان کی صدیوں کے دوران کئے تحقیق، کھوج اور تجربوں سے حاصل ہوئے علم اور ایجادوں کو اپنا لیا، اور چشم زدن میں زندگی کی ہر شعبے کی ارتقائی کڑیاں طے کئے بغیر یورپی انسان کے شانہ بہ شانہ قدم بڑھانے لگا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائینات کے کسی بھی کونے کھدرے میں انسانی جنس اگر تواریخی، تیکنیکی، سائینسی ارتقاء کے مرحلوں سے گذر چکی ہے، تو ہر خطے کا، ہر جگہ کا، ہر قوم کا، ہر نسل کا، ہر مذہب کا انسان، انسانی جنس سے وابستہ ہونے کی بناء پر ایسے ارتقاء کا وارث ہے اور ہر خطے کا انسان تواریخی ارتقاء کے مرحلوں سے گذرے بغیر اس علم اور نتیجے کو براہ راست اپنا کر مستفید ہو سکتا ہے۔

صرف انقلابی سمجھ اور ارادے کی ضرورت ہے۔

چونکہ خاندان کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے سے آگاہ ہو گئے ہیں کہ خاندان کے افراد کے مابین نجی ملکیت کا کوئی بھی احساس یا قانون نہیں ہوتا، اور خاندان سے خاندان مل کر گاؤں بن جاتے ہیں۔ گاؤں سے گاؤں مل کر قصبے اور قصبے سے قصبے مل کر انسانی معاشرے کی داغ بیل ڈالتے ہیں، اس لئے انسانی معاشرے سے استحصال کا حربہ زائل کرنے کے لئے گاؤں سے پہل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب کہ گاؤں میں خاندانوں کے پیداواری یا مادی وسائل جیسے زمین، جائیداد، باغ یا غیچے کارخانے، دوکانیں، سارے گاؤں کی مشترکہ ملکیت تصور کئے جائیں۔ چونکہ قصبے، شہر یا پورے ملک کے پیداواری ادارے جیسے ملیں، فیکٹریاں، کارخانے، خام مواد کے لئے گاؤں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ یوں گاؤں میں نجی ملکیت کا تصور زائل ہو کر سارے ملک کے پیداواری اداروں میں بھی نجی ملکیت کا تصور زائل کر دے گا۔ اور انسانی معاشرہ استحصال کا حربہ یعنی نجی ملکیت کا مفروضہ رد کر کے ایک ہمہ گیر خاندان کی صورت اختیار کرتا

جائے گا۔ ہمہ گیر خاندان جو کل انسانی جنس کے
افراد کی وحدیت کا ضامن ہوگا۔

دنیا کے کسی بھی کونے کھدرے میں جہاں بھی انسان موجود ہیں۔ وہاں انسانوں میں رابطے کا بنیادی ذریعہ زبان ہے۔ چونکہ آج کل کے دور میں ہر انسانی خاندان مختلف قومی، نسلی، مذہبی معاشروں میں محصور ملتے ہیں۔ اس لئے مختلف معاشروں میں مختلف زبانوں کا چلن ہے، حتیٰ کہ ایک ہی قسم کے مذہبی، قومی، نسلی، معاشرے میں مقید خاندان بھی مختلف زبانوں سے وابستہ ملتے ہیں۔ اس لئے انسان کو انسان کے نزدیک لانے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں انسانی جنس میں وحدت پیدا کرنے کے لئے رابطے کے واحد بنیادی ذریعے کو یعنی زبان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے انقلابی پہل کی ضرورت ہے۔ قومی، نسلی، یا مذہبی جنون کو بالائے طاق رکھ کر ایک ایسی زبان اپنانے کی ضرورت ہے، جس کو مستقبل قریب میں کل انسانی جنس نہ سہی، کم از کم برصغیر میں موجود مختلف انسانی

معاشرے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کے لئے استعمال کر سکیں؛ اور کل انسانی جنس کے ضامن انسانی خاندان پر مسلط کائناتی اُصولوں کو مختلف انسانی معاشروں پر اطلاق کا وسیلہ بن سکے۔

حادثہ کہیئے، اتفاق کہیئے یا تواریخی ارتقا، لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ہمارے اپنے برصغیر (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، برما، انڈونیشیا وغیرہ) میں انگریزی زبان کے قدم ایسے جم گئے ہیں کہ ان سب ممالک میں مختلف زبانوں کا چلن ہونے کے باوجود آپس میں کاروباری میل ملاپ اور وحدت انگریزی زبان کے صدقے حاصل کرنے کی صورت میں ہیں، اور ساتھ ساتھ سارے دُنیا کی تیکنیکی، سائینسی پیش رفت کو جذب کرنے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

برصغیر کے مختلف ممالک کی بات الگ، ایک ہی مُلک کی مختلف ریاستوں میں مختلف زبانیں استعمال کرنے والے معاشرے بھی انگریزی زبان کی وساطت سے رسل و رسائل کی کڑیاں جوڑتے ہوئے ہیں۔ کشمیر کا انسان کیرلا کے انسان کے ساتھ انگریزی زبان کی معرفت رابطہ قائم کرتا ہے اور مدراس کے انسان سے بھی اسی

زبان کے ذریعے رابطہ قایئم کرتا ہے، حالانکہ تینوں انسان ایک دوسرے کی زبان سے نابلد ملتے ہیں۔

غرضیکہ برصغیر میں کوئی بھی زبان بولنے والا انسان برصغیر میں مروج اور زبانیں بولنے والے انسان سے انگریزی زبان کے توسط سے رابطہ قایئم کرنے کی صورت میں ہے حتیٰ کہ ہمارے اپنے برصغیر میں واقع ممالک سے باہر دوسرے براعظموں کے ممالک مثلاً امریکہ، فرانس، افریقہ، مصر، آسٹریلیا وغیرہ ممالک کے انسانوں سے بھی رابطہ قایئم کرنے کی صورت میں ہے۔ ایسی فائدہ بخش صورت حال (ADVANTAGE) کو مذہبی، قومی، نسلی یا ملکی اندیشوں پر قربان کرنا اس برصغیر کے انسان کے لئے بدقسمتی ہوگی۔ جب کہ اس برصغیر کے انسان کو بدیشی ایجادات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز، بجلی، کمپیوٹر، دوائیاں، اناج، کپڑے وغیرہ اپنانے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جائے، تو ظاہر ہے کہ ہمارے برصغیر میں انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے، بدیشی انسان کے حاصل کئے علم کی بدولت کی ہے اور بدیشی زبان (انگریزی) کی وساطت سے ممکن ہو سکی ہے۔

ہمارے کردار اور سوچ کی کمزوری سے استحصالی عناصر فائدہ اُٹھاکر ہم کو بدیشی زبان کے مفروضے ہیں پابند کر کے انگریزی زبان کو اپنانے سے روک رہے ہیں۔ مذاق تو یہ ہے کہ عام زندگی میں بنگالی زبان بولنے والا انسان ہندی زبان اپنانا نہیں چاہتا۔ پنجابی زبان بولنے والا انسان مدراسی زبان بولنے والے کو دھتکارتا ہے۔ کشمیری زبان بولنے والا انسان اردو زبان بولنے والے سے خار کھائے بیٹھا ہے، جب کہ یہ سب انسان مختلف زبانوں کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے باوجود بدیشی زبان انگریزی کے استعمال میں کوئی گریز نہیں برتتے۔

جہالت کی تان یہیں نہیں ٹوٹتی۔ ایک دوسرے کے لباس، کھانے پینے کے طریقے، اُٹھنے بیٹھنے کے آداب یا مجموعی طور پر ایک دوسرے کے کلچر کو اپنانے میں ہتک محسوس کرتے ہیں، لیکن انگریزی کلچر یعنی لباس، کھانے پینے کے طریقے، اُٹھنے بیٹھنے کے آداب اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

کیوں نہ ایسی کمزوریوں، کوتاہیوں کو اس برصغیر کے انسان کی طاقت میں تبدیل کر کے زبان کے مسئلے اور زبان کے مسئلے سے

پیدا شدہ افراتفری کو مٹا کر انسان کو انسان کے نزدیک لایا جائے۔ انگریزی زبان اپنائی جائے۔ انگریزی زبان بھی اِنسانی جنس کی زبان ہے، کسی غیر جنس مثلاً حیوان، درندے، چرند و پرند، کیڑے مکوڑوں کی زبان نہیں۔ کسی بھی انسانی زبان کو بدیشی زبان کی تہمت لگا کر ردّ کرنا اِنسانی جنس کی تضحیک کرنے کے مُترادِف ہے۔ اِنسانی جنس میں رائج کوئی بھی زبان بہر صورت انسان کی زبان ہے۔ بدیشی، قومی، مذہبی، نسلی زبان کے مفروضے کھڑے کرکے انسان کو انسان سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔

ماضی انسانی اِرتقا کی تفسیر ہے۔ انسانی جنس زبان کے ذریعے ماضی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور ماضی کو نظر انداز کرنا اِنسانی جنس کے ارتقاء کو نظر انداز کرنے کے مُترادِف ہے۔ اِس لئے انگریزی زبان کو اپنانے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں رائج مختلف زبانوں کو بدستور زندہ رکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں۔ اپنے برصغیر کے انسان کو انگریزی زبان بطور تیکنیکی، سائنسی، کاروباری، یا رابطے کی زبان اپنانے کے پہلو بہ پہلو برصغیر میں رائج کسی بھی زبان سے وابستہ ہونے کی صورت میں ہم اس

زبان کو ادبی، ثقافتی زبان کے طور پر اپنانا ازبس ضروری ہے۔ اس طور برصغیر کا ہر انسان ماضی سے ملے ورثے میں ارتقاء کی تفسیر اور انفرادیت کو برقرار رکھ کر انسانی جنس کی وحدت کا پیش کار بن سکتا ہے، اور حقیقی ہمہ گیر انسانی معاشرے کی تکمیل کرنے میں اپنا حصّہ ادا کرسکتا ہے۔

زیرِ مطالعہ صفحات میں انسانی جنس کے ارتقا کا جا بجا ذکر ہوا ہے۔ کہیں سماجی ارتقا کا کہیں طبیعیاتی ارتقاء کا اور کہیں تواریخی ارتقاء کا۔ اس لئے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ "ارتقاء" کی تفسیر کیا ہے۔ اس کے محرک کائینات کے کونسے اصول ہوتے ہیں، اور مستقبل قریب میں انسانی جنس ارتقاء کی کونسی منزل اپنانے کی سعی میں ہے۔

صدیوں کی کھوج، مشاہدوں اور تجربوں کے بعد کائینات کی ایک اٹل حقیقت انسان کے سامنے بے نقاب ہوئی ہے کہ اس ساری کائینات میں بکھری جو چیز یا شئے جس لمحے جس حالت (STATE) میں موجود ہے۔ کسی صورت اپنی حالت بدلنے پر تیار نہیں، جب تک نہ اِرد گرد ماحول میں بدلتی ابھرتی طاقت یلغار کرکے اس چیز یا شئے کو حالت (STATE) بدلنے پر مجبور نہ کرے، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کائینات میں ہر شئے کی حالت

کے طابع ہو جاتی ہے، اور بدستور برقرار رکھنے کے لئے موافق تبدیلی
اپنانے سے گریز نہیں کرتی۔

مثلاً گرمی کے منفی درجے کے ماحول میں پابند سیال پانی برف کی ٹھوس صورت
اختیار کرتا ہے۔ لاکھ جتن کئے جائیں، لیکن جب تک ماحول بدل نہیں جاتا۔
ٹھوس برف سیال پانی کی صورت اختیار کرنے سے عاری ہوتا ہے، لیکن جونہی
گرمی کے منفی درجے کا ماحول تبدیل ہو کر منفی درجے کی گرمی سے آگے قدم بڑھاتا
ہے، تو نئے ماحول میں رچی مزید قوت کا مقابلہ اپنی ساخت میں رچی قوت سے
نہ کر سکنے کے سبب ٹھوس برف سیال پانی کی صورت اختیار کرنے پر مجبور ہوتا
ہے اور نئے ماحول کے طابع کسی صورت پرانی حالت پر قرار نہیں رکھ پاتا۔ ایسی
صورت حال ہو جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ ٹھوس برف نئے ماحول کے طابع ارتقاء
پذیر ہو کر پانی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ گرمی کے ماحول میں مزید اضافہ ہو جائے
تو پانی کی ساخت میں رچی قوت اس مزید طاقت کی یلغار کے سامنے ہتھیار
چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے، اور نئے ماحول کے زیر اثر اپنی صورت کسی طور
نہ برقرار رکھ کر بھاپ بن کر فضا میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت
میں پانی ارتقا کا ایک اور مرحلہ طے کر پاتا ہے۔ نتیجہ اخذ ہوتا ہے
کہ کسی شے کا ارتقاء ماحول کی تبدیلی کے تحت تبدیلی کی تفسیر کا غماز،

کسی قسم کے ماحول میں تبدیلی عارضی (PHYSICAL) ظاہر ہوتی ہے جیسے اوپر دی گئی مثال میں (برف، پانی، بھاپ) واقع ہوتی ہے۔ اور کسی قسم کے ماحول میں تبدیلی دائمی یعنی کیمیائی (CHEMICAL) یا طبیعیاتی (BIOLOGICAL) ہوتی ہے۔ جیسے زندگی کی ایک جنس بتدریج کروڑوں، اربوں برس کے طبیعیاتی ارتقاء کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے گوریلا (GORRILA) چمپانزی (CHIMPANZEE)، بن مانس (APE) کے بعد آج کے انسان (HUMAN) کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ ارتقاء کا عمل اس حقیقت کی گواہی ہے کہ کائنات میں ہر شے بدلتے ماحول کے ساتھ ساتھ اپنی حالت میں متناسب تبدیلی کی پابند ملتی ہے۔

موجودہ دور میں نئے قسم کے بیج، نئے قسم کے پالتو جانور، نئے قسم کے پھل پھول، نئی قسم کی دھاتیں، اسی تفسیر کی تعبیر ہے۔

انسان سے کم ذہن رکھنے والے اور زندہ جنس مثلاً چرند، پرند، درندے حیوان، گھاس پھوس وغیرہ وغیرہ۔ ارتقاء کے محرکات کی نشاندہی نہیں کر پاتے ہیں۔ اس لئے اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کی خاطر غیر ارادی طور پر (INSTINCTIVELY) جو بھی ہو سکے ہر قوت سے برسر پیکار ہیں اور ارتقاء کی یورش کے سامنے بے بس ہوتے جاتے ہیں، لیکن حضرت انسان اپنی جنس

بدستور برقرار رکھنے کی خاطر ارتقاء کے علم سے لیس ارادتاً (DELIBERATELY)
نبرد آزما ملتا ہے، اور ارتقاء کی یورش کے سامنے سینہ سپر ملتا ہے۔
صدیوں کی تہذیب و تمدن اسی ایک حقیقت کا پرتو ہے۔
ظاہر ہے سردی کے ماحول کی طاقت کی یلغار کے سامنے انسان کی حالت
میں زیادہ طاقت نہیں ہے، اس لئے انسان اپنی حالت بدستور برقرار
رکھنے سے قاصر ہوتا ہے، اور ارتقاء کے عمل کے تحت اپنی ساخت میں
مناسب تبدیلی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے، لیکن ارتقاء کے علم کے
برتنے پر انسان اپنا ذہن استعمال کر کے کائنات سے گرمی کی قوت
مستعار لے کر سردی کی قوت کا مقابلہ کرتا ہے، اور بدلتے ماحول کے
باوجود اپنی صورت میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر اپنی حالت بدستور
برقرار رکھنے کے قابل ہے۔ بصورت دیگر برفانی علاقوں میں سردی کے
ماحول میں برقرار رہنے کے لئے بدن پر بال اگانے کی نوبت پہنچتی۔
انسان کو چلنے دوڑنے پر اپنی بہت ساری قوت صرف کرنی
پڑتی تھی۔ لیکن انسان نے اپنے زرخیز دماغ کے بل بوتے پر کائنات
میں سرگرداں بے پناہ قوت کا سہارا لے کر موٹر، ریلیں، ہوائی جہاز،

خوراک حاصل کرنے پر قوت صرف کرنے کے بجائے کائینات کی بے پناہ قوت کو تابع بنا کر بل، ٹریکٹر، پمپ وغیرہ بنائے اور صحراؤں کو لالہ زاروں میں تبدیل کر کے اپنی صورت بدستور برقرار رکھنے میں زندگی کی ہر اور جنس سے پیش پیش رہا۔

انسان چاند ستاروں کے کٹھن ماحول میں اپنی حالت بدستور برقرار رکھنے کے قابل نہیں، لیکن انسان نے چاند ستاروں پر بھی زمین جیسا ماحول پیدا کر کے اپنی صورت بدستور برقرار رکھنے کی سبیل ڈھونڈھ نکالی۔ کسی کائیناتی سانحے کی وجہ سے زمین کا ماحول انسانی جنس کے لئے ساز گار نہ رہے، تو اُس صورت میں انسان کسی اور سیارے، ستارے یا شمسی نظام میں اپنے ذہن کے بل بوتے پر اپنی موجودہ صورت بدستور برقرار رکھنے کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنے کے قابل ہے۔

ارتقاء کے محرکات کا مزید مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ارتقا کے دوران جس شے کی ضرورت نہیں رہتی وہ چیز اپنی مخصوص ساخت بدستور برقرار نہ رکھ کر مٹ جاتی ہے۔ یوں ارتقاء کے دوران انسان کو دُم کی ضرورت نہ رہی اور انسان کی دُم گھٹتے گھٹتے غائب ہو گئی۔ اس صورت میں انسان چلنے دوڑنے کے لئے ٹانگوں کے بجائے

موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ لگاتار استعمال کرے، تو ارتقاء کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ٹانگوں کی ضرورت نہ رہے اور انسان کی ٹانگیں گھٹتے گھٹتے بالکل ہی غائب ہو جائیں۔ اس صورت میں انسان ارتقاء کی اگلی سیڑھی کی جانب قدم بڑھائے گا۔ ایسے مرحلے پر شاید انسان کو انسان کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا، بلکہ مختلف طبیعاتی ساخت کی بنا پر کسی اور نام سے نوازا جائے گا۔ لیکن جیسے واضح کیا جا چکا ہے کہ کائنات کی ہر اور جنس کی طرح انسان بھی اپنی حالت کا غلام ہے۔ یہی وجہ ہے انسان، موٹر، ہوائی جہاز، راکٹ استعمال کرنے کے باوجود اپنی ساخت وصورت بدستور برقرار رکھنے کے لئے غیر پیداواری حرکات پر بے دریغ اپنی قوت لٹاتا پھرتا ہے۔ کبھی فٹ بال کھیلتا ہے، تو کبھی ناچتا پھرتا ہے، کبھی صحراؤں کی خاک بیدل چھانتا ہے اور کبھی پہاڑوں کی آوارہ گردی کرتا ہے۔ ایسے موقعے حاصل نہ ہوں، تو خواہ مخواہ میدانوں، سڑکوں پر دوڑتا پھرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ ٹانگیں یا بدن کے باقی حصے بےکار رہ کر مخصوص طبیعاتی ساخت سے محروم نہ ہوں۔

حیاتی طور پر بھی انسان اپنے حیات کا غلام رہتا ہے۔

الیکٹرانک اور دیگر آلات کے برتنے پر انسان اپنے گرد و پیش (ماحول) کا تجزیہ چشم زدن میں کرنے کی صورت میں ہے۔ تب بھی انسان اپنے حسیات یعنی چھونے کی حس، سونگھنے کی حس اور سننے چکھنے کی حس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب کبھی اِن حسیات میں کمی بیشی پاتا ہے تو ڈاکٹروں، حکیموں سے رجوع کرکے ان حسیات کو بدستور اپنی اِبتدائی صورت میں لانے کی سعی کرتا ہے۔ علم طب انسان کے اِنہی ارادوں کی تکمیل ہے۔

اِنسان جذباتی طور پر بھی اپنے جذبات میں تبدیلی کرنے پر تیار نہیں مِلتا۔ قدرت نے تولید کے مرحلے کو پورا کرنے کے لئے لذت کے جذبات پیدا کئے ہیں۔ اِس طور لذت کا رشوت دے کر اِنسان کو تولید کے پیچ در پیچ مراسم قایم رکھنے پر آمادہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ آبادی کے سیلاب سے گھبرا کر تولید کے مرحلے کو ختم کرنے کے لئے مختلف طریقے مثلاً دوائیں، لوپ حتیٰ کہ بدن کی کانٹ چھانٹ بھی انسان نے برداشت کی۔ حالانکہ تولید کے مراسم کو درگذر کرنے سے آبادی کی روک تھام زیادہ موثر رہتی۔ لیکن جذبات

اور لذّت سے بدستور لطف اندوز ہونے کی خاطر انسان تولید کے مراسم کو اپنی زندگی سے ایک لمحے کے لئے بھی خارج کرنے پر تیار نہیں۔

غرضیکہ ارتقاء کی موجودہ منزل پر کھڑی انسانی جنس طبیعیاتی، تکنیکی، ذہنی ساخت اور صورت کی بناء پر اس قابل ہے، کہ موجودہ صورت برقرار رکھنے کے لیے مناسب ماحول کی تعمیر کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے اور اغلب ہے کہ انسان کی طبیعیاتی ساخت و صورت ارتقاء کے سفر میں منجمد ہو کے رہ جائے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کا دماغ روز بروز وسعت پکڑتا جا رہا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے شعبے میں پیش رفت کی وجہ سے انسان کا بدن زیادہ تندرست، فربہ اور قد آور ہوتا جا رہا ہے اور انسان جسمانی (PHYSICAL) اعتبار سے ارتقاء پذیر ہو رہا ہے، لیکن ارتقاء کے تصوّر میں ماپ تول یا تناسب ارتقاء کی تفسیر نہیں ہوتی۔ ہوتی تو ہر فرد کا بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کا سفر انسانی جنس کے ارتقاء میں شامل سمجھا جاتا۔ زندہ جنس میں دراصل ارتقاء دائمی طبیعیاتی، کیمیائی تبدیلی کا نام ہے۔

سماجی یا معاشرتی طور پر بھی انسانی جنس مختلف ارتقائی

مرحلوں سے گذر کر مثلاً قبائلی معاشرہ، جاگیرداری معاشرہ، سرمایہ داری معاشرہ وغیرہ مرحلوں سے گذر کر اشتراکیت کی منزل تک پہنچ رہی ہے۔ چونکہ اشتراکیت (مارکسزم) کے اصول انسانی جنس کے خاندان پر حاوی کائنات کے اصولوں کے غماز ہیں۔ اغلب ہے کہ انسان کا سماجی ارتقاء بھی اشتراکیت کی منزل پر ہی منجمد ہو کے رہ جائے گا۔

ہاں۔۔۔۔ تواریخی ارتقا تب تک جاری رہے گا جب تک کائنات قایم ہے۔ اب تک انسانی جنس کے تواریخی ارتقا میں سمندروں کو کھنگالنے کا ذکر ہے۔ فلک بوس چوٹیوں کو سر کرنے کا ذکر ہے۔ مادے اور قوت کی کھوج کا ذکر ہے۔ غرضیکہ دنیا کو ٹٹولنے پہچاننے کا ذکر ہے۔ آگے کی منزل پر چاند تاروں کو کھنگالنے کا ذکر ہوگا۔ کہکشاں کو سر کرنے کا ذکر ہوگا۔ اپنی اس چھوٹی سی دنیا سے پرے کائنات کو تسخیر کرنے کا ذکر ہوگا ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(اقبال)

{اسی سلسلے کی پہلی کتاب "پہچان" کے متعلق جناب عبدالستار رنجور، کہنہ مشق شاعر، مشہور صحافی اور سیاستدان کے تاثرات}

سلام

ایک جہان انسان
معزز دوست بھائی
کے نام
سلام
ہے سلام
میرا سلام

درد و خلوص اور قدر و احترام کا سلام
السلام اے دوست تجھ کو آفریں
مرحبا صد مرحبا صد آفریں
مان کر تو نے علم و حکمت کے لئے
بخش دی ہے اک ادائے دلنشیں

آج عید کا دن ہے
قربانیوں کا دن

عظمتِ آدم کو سلام کرنے کا دن

مُبارک کرنے کا دن

روز اسی دن علی الصباح

سب سے پہلے

میں تمہیں اور تمہاری خردمندی کو

گرانقدر قدر و کاوش کو

تجسّس اور جستجو کو

کہ جس کے پیچھے وحدتِ کل کی

اَبدی حقیقتوں کا فلسفہ

کائناتی علم و حکمت کے اظہار کا جذبہ کار فرما ہے

کہ جس کے اِظہار میں

"پہچان" نام کی مختصر

مگر ایک مبسوط تخلیق بھی ہے،

جس میں

متحان ادائے بیان

حلیلیات مادیات کائنات کو
عطا ہو گیا ہے
ادا طرزِ بیان کا
اِک آسان ترین فن
اور فن کو مل گئی ہے
اِک عام بول چال کی زبان
یہی تو علامت ہے
فلسفیانہ علم و ادب کے
اظہار و تشہیر کے
عروج و معراج کی دلالت کی
آئینہ دار ہے حسنِ دلیل کی
"پہچان"
وہی جو گرانمایہ تحفہ
آپ نے اپنے دور کے
خضرِ راہ کو کل ہی پیش کیا ہے
کہ حسن کی روشنی میں

یارانِ طرزِ نگارش سے دُور
غمگسارانِ کون و مکاں سے دُور
تلاشِ فکر و نظر کے متلاشی رنجورنے
اس گھمبیر گرد و غبار کی
اندھیریوں کے پیچھے
اسرار و رموز دہریت کے
درِ آگہی سے
ایک اور مریضِ عشق کو
پہچان لیا ہے

●

ہاں پہچان گیا میں
تمہیں پہچان گیا
تمہارے طرزِ سخن کو
تمہارے فکر و فن کو ... پہچان گیا میں
اک تمہاری ہی
"پہچان" سے

کہاں ہو میرے دوست

تم کہاں ہو
آ میں تجھے گلے لگا لوں
اور تمہارے جبینِ فکر سے
اک بوسہ بھی لوں
کچھ اپنی دردِ نہاں کی
ذرا پیاس بھی بجھا لوں
آؤ اور آ بھی جاؤ
ذرا اس غمِ دورانِ جہاں کی
مہک کو بھی سونگھ جاؤ
منتظر در انتظار
چشم براہ
منظور کشمیری
۸۔۹۔۱۹۸۲ء

مصنّف کے دیگر تصانیف

- جہلم کے سینے پر ——— افسانوں کا مجموعہ
- عورت ——— افسانوں کا مجموعہ
- سیلاب اور قطرے ——— ناول
- پہچان ——— انسانی جنس کی تفسیر

•

زیرِ طبع

تلاش

(افسانوں کا مجموعہ)